فنِ ترجمہ نگاری

مُرتّبہ

خلیق انجم

www.kitaabistan.com

فنِ ترجمہ نگاری

مرتبہ

خلیق انجم

Scanning Project 2015

Book No.92

Donated By:
Dr.Saeed Qadri
Shabnam Aman

Special Courtesy :
Salman Siddqui
Amin Tirmizi

Managed By:
Rashid Ashraf
zest70pk@gmail.com
www.wadi-e-urdu.com

www.kitaabistan.com

© خلیق انجم

اشاعتِ اول : ——— اپریل ۱۹۹۵ء
اشاعتِ دوم : ——— اکتوبر ۱۹۹۵ء
اشاعتِ سوم : ——— ستمبر ۱۹۹۶ء
قیمت : ——— ۶۰/ روپے
طباعت : ——— ثمر آفسٹ پرنٹرز، نئی دلی

FAN-E-TARJUMA NEGARI
EDITED BY : KHALIQ ANJUM
Price Rs. 60.00
IRD EDITION, 1996

تقسیم کار

سرسید بک ڈپو، جامعہ اردو
میڈیکل روڈ، علی گڑھ
(اتر پردیش)

انجمن ترقی اُردو (ہند)
اُردو گھر، راؤز ایونیو
نئی دلی

فہرست

حرفِ آغاز	خلیق انجم	۷
اردو ترجمے کا ارتقا	خلیق انجم	۹
ترجمے کی ضرورت	ڈاکٹر مرزا حامد بیگ	۲۲
ترجمے کی ضرورت	انیس ناگی	۵۵
ترجمے کی اہمیت	شہباز حسین	۶۲
ترجمے کی ضرورت	جیلانی کامران	۶۹
ترجمے کے بنیادی مسائل	ڈاکٹر ظ۔ انصاری	۷۷
ترجمے کے چند پہلو	سید ہاشمی فرید آبادی	۱۱۰
دریافت اور بازیافت	شمس الرحمٰن فاروقی	۱۲۱
شاعری کا ترجمہ	خلیق انجم	۱۳۵
اصولِ اصطلاح سازی	مولوی وحید الدین سلیم	۱۴۶
اردو سے ہندی میں ترجمے کے مسائل	ابوالفیض سحر	۱۵۹
انتظامیہ کی کچھ اہم انگریزی، ہندی اور اُردو اصطلاحات	خلیق انجم	۱۶۹

www.kitaabistan.com

حرفِ آغاز

بہار اور یوپی کی صوبائی حکومتوں کے فیصلے کے مطابق سرکاری دفاتر میں اردو میں درخواستیں قبول کی جاتی ہیں۔ اور ان درخواستوں کا جواب بھی اردو ہی میں دیا جاتا ہے۔ طریقۂ کار یہ ہے کہ مترجم درخواست کو اردو سے ہندی میں ترجمہ کر کے متعلقہ افسر کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اور جب افسر اس درخواست کے بارے میں کوئی فیصلہ کرتا ہے۔ تو مترجم اس فیصلے کا ہندی سے اردو میں ترجمہ کر کے درخواست دہندہ کو بھیج دیتا ہے۔ سینکڑوں کی تعداد میں بہار اور یو۔پی میں مترجموں کا تقرر کیا جا چکا ہے اور ہزاروں کی تعداد میں ابھی تقرر ہونا باقی ہے۔

پچھلے دنوں جامعہ اردو علی گڑھ، کی مجلس عاملہ میں طے پایا کہ بہار اور اتر پردیش میں مترجموں کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ادیب کامل کے امتحانات میں ترجمے کا ایک پیپر بھی شامل کیا جائے۔ جس سے طلبہ کو ترجمہ نگاری کے فن سے واقفیت حاصل ہو سکے۔

میرے استاد محترم اور جامعہ اردو علی گڑھ کے وائس چانسلر پروفیسر مسعود حسین خاں نے حکم دیا کہ اس پیپر کے لیے میں فوری طور پر ایک کتاب تیار کروں۔ ان کے حکم کی تعمیل میں یہ کتاب حاضر ہے۔ میں ایم حبیب خاں صاحب کا شکر گزار ہوں جنھوں نے اس کتاب کی تیاری میں میری بہت مدد کی۔ میں نے کوشش کی ہے کہ اس کتاب سے ان تمام طلبہ کی رہنمائی ہو سکے، جو کسی بھی زبان [illegible] ترجمہ کرتے ہیں۔ کتاب عجلت میں تیار کی گئی ہے۔ اس [illegible] ممکن ہے کہ اس میں کچھ کوتاہیاں [illegible] چوں کہ نصاب کی کتاب ہے اور ہر سال دو سال بعد [illegible] میں نیا اڈیشن شائع ہوگا۔ اس [illegible] کوشش ہوگی کہ ہر اڈیشن پہلے اڈیشن کے مقابلے زیادہ مفید اور بہتر ہو۔

قمر رئیس

کربلا [illegible]

www.kitaabistan.com

خلیق انجم

اردو ترجمے کا ارتقا

ترجمے کا فن اتنا ہی قدیم ہے، جتنا کہ انسان کی سماجی زندگی۔ جب ایک سماجی گروہ کا دوسرے گروہ سے سماجی رشتہ قائم ہونے پر ایک دوسرے کی بات سمجھنے کے لیے ترجمے کا سہارا لینا پڑا ہوگا۔ تو ترجمہ کچھ آوازوں اور کچھ اشاروں پر مبنی ہوگا۔ حملہ آوروں، سفیروں اور سیاحوں وغیرہ کی بنیادی ضرورت یہ تھی کہ وہ دوسرے لوگوں کو اپنی بات سمجھا سکیں۔ اس سے پہلے کہ یہ لوگ ایک دوسرے کی زبان سمجھنے کے قابل ہوتے، کسی ترجمان کے ذریعے انھوں نے ایک دوسرے تک اپنی بات پہنچائی ہوگی۔

قدیم ہندوستان کی غیر معمولی ترقی یافتہ تہذیب کو دیکھتے ہوئے یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اس عہد میں ترجمے کا عام رواج ہوگا۔

یہاں ہم اپنی بات مغل عہد سے شروع کر رہے ہیں۔

مغلوں کے عہد میں سرکاری ضرورتوں سے مختلف زبانوں سے فارسی میں اور فارسی سے ان زبانوں میں لازمی طور پر ترجمے ہوتے ہوں گے۔ لیکن مغل بادشاہوں نے ہندوستانی ادب کی طرف بھی خاص طور سے توجہ کی۔ عہدِ اکبری میں ایسے ہندوؤں کی تعداد بہت زیادہ تھی، جو فارسی سے بخوبی واقف تھے۔ اکبر کو سنسکرت سے بہت لگاؤ تھا۔ اس نے سنسکرت سے شاعری فلسفہ، ریاضی، الجبرا وغیرہ کی کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کرایا۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے ۱۵۷۴ء میں "سنگھاسن بتیسی" "خرد افروز" کے نام سے ترجمہ کرایا۔ ۱۵۷۵ء میں بدایونی نے بہاون نامی ایک پنڈت سے "اتھروید" کا فارسی میں ترجمہ شروع کرایا لیکن یہ کام پورا نہ ہو سکا۔ شیخ فیضی اور حاجی ابراہیم تھانیسری نے یہ کام مکمل کرنے کی کوشش کی لیکن یہ دونوں بھی کامیاب نہیں ہوئے۔ ملا بدایونی نے "رامائن" کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ بدایونی نے یہ ترجمہ

خود نہیں کیا تھا بلکہ ان کی نگرانی میں کسی اور نے یہ کام کیا تھا۔ ۱۵۸۹ء میں ملا بدایونی نے "تاریخ کشمیر" کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ اکبر ہی کے عہد میں کئی علما نے مل کر "مہابھارت" کا فا... میں ترجمہ کرنا شروع کیا جو ۱۵۹۱ء میں مکمل ہوا۔ اسی زمانے میں "لیلاوتی"، "نل دمن"، "تاج... اور "ہری بنس" وغیرہ کے ترجمے تیار ہوئے۔ دلچسپ بات ہے کہ ان ترجموں کی تیاری میں ہن... اور مسلمان عالم دونوں برابر کے شریک تھے۔

ترجمے کا کام صرف ہندوستان تک ہی محدود نہیں تھا۔ دوسری ہجری کے وسط ... ہندوستان سے باہر کے مسلمانوں کے ہندوستان سے علمی تعلقات قائم ہو چکے تھے۔ ... میں سندھ سے ایک وفد خلیفہ منصور عباسی کے دربار میں گیا تھا۔ اس وفد میں ایک ا... پنڈت بھی شامل تھے جو ہیئت اور ریاضیات کے ماہر تھے۔ یہ پنڈت اپنے ساتھ ہی... کی مشہور کتاب "سدھانت" لے گیا تھا۔ خلیفہ کو جب اس کتاب کے مندرجات کا علم ہوا... اس نے اپنے دربار کے ایک ریاضی دان ابراہیم فزاری کو حکم دیا کہ وہ اس کا عربی میں تر... کریں۔ جو پنڈت اپنے ساتھ یہ کتاب لے کر بغداد گیا تھا اسے علم ہیئت میں غیر معمولی مہارت کی وجہ سے بہت عزت حاصل ہوئی۔ بغداد کے دو عالم اور ماہر ہیئت ابراہیم فزاری... اور یعقوب بن طارق پنڈت کے شاگرد ہو گئے۔ ان دونوں شاگردوں نے اپنے استاد... طریقے سے "سدھانت" کے بنیادی اصولوں کو عربی میں منتقل کیا۔ ہیئت کے علاوہ ریاضی اور دوسرے علوم کی کتابوں کا بھی عربی میں ترجمہ کیا گیا۔ ان میں دو کتابیں بہت اہم ہیں۔ ایک "کلیلہ و... اور دوسری "یوذاسف و بلوہر"۔ "کلیلہ و دمنہ" "پنچ تنتر" کا ترجمہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ساسانیو... کے عہد میں ان دونوں سنسکرت کتابوں کا ترجمہ پہلوی میں ہوا اور پہلوی سے عربی ... عربی میں ان دونوں کتابوں کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ دنیا کی بہت سی ترقی یافتہ ... عربی سے ان کتابوں کا ترجمہ کیا گیا۔

ڈاکٹر سید عبداللہ نے اس سلسلے میں ایک اور کتاب "یوذاسف و بلوہر" کا ذکر کیا جس کا عربی میں ترجمہ کیا گیا۔ اس کتاب میں گوتم بدھ کے حالات زندگی بیان کیے گئے ہیں ا... بقول ڈاکٹر سید عبداللہ۔ گوتم بدھ کی تعلیمات کو تمثیلی حکایات کے پیرایے میں نہ...

...نشیں انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ سنسکرت کے قصے کہانیوں، جادو ... کا فارسی کیمیا، حکومت کرنے کے طریقوں اور لڑائی کے فن پر متعدد کتابیں عربی سے اردو میں ... کی گئیں۔ "مہابھارت" کا خلاصہ عربی زبان میں تیار کیا گیا تھا۔

... سترہویں صدی میں جن لوگوں نے اردو میں نثری اور شعری ادب کا آغاز کیا۔ ان کی علمی ...ان فارسی تھی اسی لیے اردو کے ابتدائی شعری اور نثری سرمایے پر فارسی زبان و ادب کا ...را اثر ہے۔ یہ اثر تشبیہات و استعارات، تلمیحات، الفاظ اور فارسی کے اصنافِ سخن وغیرہ ... استعار لینے تک ہی محدود نہیں رہا، بلکہ ہزاروں فارسی اشعار کا اردو میں ترجمہ بھی کیا گیا۔

اردو ادب کے ابتدائی عہد میں بہت بڑی تعداد میں فارسی، عربی اور سنسکرت سے ... و نثر میں ترجمے کیے گئے۔ یہ ترجمے مذہب، تصوف، شاعری، داستانیں، ہیئت، فلسفے ... کتابوں کے تھے۔ ان کتابوں کی تفصیل بیان کرنے کے لیے ایک پوری کتاب کی ضرورت ... ہوگی۔ یہ کہنا تو مشکل ہے کہ اردو میں پہلا ترجمہ کون سا ہے۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ شاہ ...میراں جی خدا نما نے ابوالفضائل عبداللہ بن محمد عین القضاۃ ہمدانی کی تصنیف "تمہیداتِ ہمدانی" ... سے اردو میں جو اردو ترجمہ کیا تھا، وہ اردو کا پہلا ترجمہ ہے۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ ...نے ... وجہی نے پہلی بار شاہ جی نیشاپوری کی فارسی تصنیف "دستورِ عشاق" کا اردو میں "سب رس" ... نام سے ترجمہ کیا۔ ۱۷۰۴ء میں شاہ ولی اللہ قادری نے شیخ محمود کی فارسی تصنیف "معرفت السلوک" ... اردو میں ترجمہ کیا۔[1]

... اٹھارویں صدی عیسوی کے اوائل میں سید محمد قادری کی فارسی تصنیف "طوطی نامہ" کا ... ہوا۔ تقریباً اسی زمانے میں فضل علی فضلی نے ملا حسین واعظ کاشفی کی فارسی کتاب ...الشہدا" کا اردو میں "کربل کتھا" کے نام سے ترجمہ کیا۔

... ان ترجموں کے بارے میں یہ بتانا ضروری ہے کہ یہ ترجمے باقاعدہ ترجمے نہیں بلکہ

---

[1] ابتدائی اردو ترجموں کے بارے میں معلومات نثار احمد قریشی کے مقالے "اردو میں نثری تراجم کی ... کا مختصر جائزہ" مشمولہ ترجمہ، روایت اور فن، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء سے لی گئی ہیں۔

کتابوں کی تلخیص یا آزاد ترجمہ ہوتے تھے۔ ان میں ترجمہ نگاری کے ان سائنٹی فک اصولوں کی پابندی نہیں کی جاتی جو اچھے ترجموں کے لیے ضروری ہیں۔

عیسائیوں نے جب ہندوستان میں تاجروں کی حیثیت سے قدم رکھا تو ان کے مبلغین نے اپنی مذہبی کتابیں ترجمہ اور تالیف کر کے شائع کیں۔ اٹھارویں صدی کے وسط میں انھوں نے توریت اور انجیل کے اردو ترجمے شائع کیے۔ کہا جاتا ہے کہ اس سلسلے کی پہلی کتاب "کتاب پیدائش کے پہلے چار بابوں کا ترجمہ ہندوستانی" ہے۔ جس کا ترجمہ بنجمن شولٹز Benjamain Schultze نے کیا تھا۔ اس کے بعد شولٹز نے "کتاب دانیال" کا اردو ترجمہ شائع کیا۔ ان تمام کتابوں کی فہرست سی۔ اے گیریرسن نے اپنی کتاب "ہندوستان کا لسانی جائزہ" جلد نہم میں دی ہے۔

اردو میں قرآن شریف کا پہلا ترجمہ مولانا شاہ رفیع الدین نے کیا۔ یہ ترجمہ لفظی تھا یعنی قرآن شریف کے ہر لفظ کا اس طرح ترجمہ کیا گیا کہ اردو فقروں کی ساخت بالکل بدل گئی۔ اس ترجمے میں سلاست اور روانی نہ ہونے کی وجہ سے اصل مفہوم سمجھنا مشکل تھا۔ شاہ رفیع الدین نے یہ ترجمہ ۱۷۷۶ء میں کیا تھا۔ تقریباً نو سال بعد یعنی ۱۷۹۵ء میں شاہ رفیع الدین کے چھوٹے بھائی شاہ عبدالقادر نے بھی قرآن شریف کا اردو میں ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ پہلے ترجمے کے مقابلے میں زیادہ سلیس، شگفتہ اور آسانی سے سمجھ میں آنے والا تھا۔

فورٹ ولیم کالج

اب تک اردو میں جتنے تراجم ہوئے تھے، وہ انفرادی کوششوں کا نتیجہ تھے۔ فورٹ ولیم کالج پہلا ادارہ تھا، جس نے منظم اور باقاعدہ طریقے پر عربی، فارسی اور سنسکرت سے اردو میں ترجمے کیے۔

فورٹ ولیم کالج کے قیام کا پس منظر یہ ہے کہ انگریز ٹیپو سلطان کو ہندوستان میں اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ٹیپو سلطان ایک ایسا دلیر، بہادر اور دور اندیش فرماں روا تھا کہ اگر اس کے اپنے آدمی دھوکا نہ دیتے تو وہ سرزمینِ ہندوستان

سے انگریزوں کو ہمیشہ کے لیے نکال دیتا۔ بہرحال ہندوستانی غداروں کی مدد سے انگریزوں نے ٹیپو سلطان کو شکست دے دی اور چوں کہ یہ ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی غیر معمولی کامیابی تھی۔ اس لیے انگریزوں نے ٹیپو سلطان پر فتح حاصل کرنے کی خوشی میں زبردست جشن منایا۔ فورٹ ولیم کالج بھی اسی جشن کی ایک کڑی تھی۔ ٹیپو سلطان پر فتح کی پہلی سالگرہ ۱۰ جولائی ۱۹۱۸ء کو بڑی دھوم دھام سے منائی گئی۔ اس دن گورنر جنرل ویلزلی نے فورٹ ولیم کالج کا افتتاح کیا۔ اس کالج کا اصل مقصد یہ تھا کہ بنگال، مدراس اور بمبئی کی ریاستوں کے جونیئر سول ملازموں کو ہندوستانی زبانیں سکھائی جائیں اور اس کے ساتھ ہی ایسے مختلف علوم کی تعلیم دی جائے، جنھیں حاصل کر کے وہ اپنا سرکاری کام بہتر طریقے سے کر سکیں۔ اس کالج میں جن زبانوں کو پڑھانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ ان میں ہندوستانی یعنی اردو سب سے اہم زبان تھی۔ کالج میں ہندوستانی زبان کا ایک باقاعدہ شعبہ قائم کیا گیا اس شعبے کے لیے گل کرسٹ کو پروفیسر کی حیثیت سے مقرر کیا گیا۔ گل کرسٹ کو سب سے پہلے جس مشکل کا سامنا کرنا پڑا وہ یہ تھا کہ ہندوستانی زبان پڑھانے کے لیے نصابی کتابیں بالکل نہیں تھیں اس لیے انھوں نے سب سے پہلے نصابی کتابی تیار کرنے کی طرف توجہ دی۔

کالج کے نصاب میں شامل کرنے کے لیے ساٹھ کتابیں تیار کی گئیں۔ ان میں تراجم بھی تھے تالیفات اور تصنیفات بھی۔ تراجم میں پابند ترجمے بھی تھے اور آزاد ترجمے بھی۔ پابند ترجمے اسے کہا جاتا ہے، جس میں اصل زبان کے پورے مفہوم کو دوسری زبان میں منتقل کیا جائے اور آزاد ترجمہ وہ ہوتا ہے جس میں مترجم اصل زبان میں مفہوم سمجھ کر اسے دوسری زبان میں لکھ دیتا ہے۔

فورٹ ولیم کالج میں جن ادیبوں نے اردو میں ترجمے کیے ان کے نام ہیں عبداللہ مسکین کاظم علی جوان، بہادر علی حسینی، مظہر علی خاں ولا، شیر علی افسوس، حیدر بخش حیدری، خلیل علی خاں اشک، حمیدالدین بہاری، کندن لال، باسط خاں، میر ابوالقاسم، طوطا رام، محمد بخش، میر جعفر، مولوی عنایت اللہ، نہال چند، غلام اکبر، حاجی مرزا مغل، غلام شاہ بھیک

محمد بخش، محمد عمر، شاکر علی وغیرہ۔

فورٹ ولیم کالج کے بعد اردو ترجمے کی تاریخ میں دوسرا اہم ادارہ دلّی کالج تھا۔

دہلی کالج

فورٹ ولیم کالج کے تراجم دہلی کالج کے تراجم سے بالکل مختلف تھے۔ فورٹ ولیم کالج میں انگریزوں کو اردو پڑھانے کے لیے ترجمے کرائے گئے تھے جب کہ دہلی کالج میں ہندوستانیوں کو مغربی تعلیم دینے کے لیے بڑے پیمانے پر ترجمے کیے گئے۔ اس لحاظ سے دہلی کالج کو فورٹ ولیم کالج پر فوقیت حاصل ہے۔

۱۷۹۲ء میں دہلی کے مدرسۂ غازی الدین میں مشرقی علوم کا ایک مدرسہ قائم کیا گیا۔ یہ مدرسہ نواب غازی الدین خاں فیروز جنگ ثانی خلف نواب نظام الملک آصف جاہ نے تعمیر کیا تھا۔ اس مدرسے میں تقریباً تیس سال تک عربی، فارسی اور مشرقی علوم کی تعلیم دی جاتی رہی۔ جب انگریز نے ہندوستانیوں کی تعلیم کی طرف توجہ کی تو ۱۸۲۵ء میں اس مدرسے کو ایک باقاعدہ کالج کی صورت دے دی گئی۔ ایک انگریز جے۔ ایچ۔ ٹیلر J.H. Taylor اس کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ ایک ہیڈ مولوی اور دو مولویوں کا تقرر کیا گیا۔ اس وقت اس کالج میں عربی اور فارسی کے ذریعے تعلیم دی جاتی تھی۔ ۱۸۲۸ء میں کالج میں ایک انگریزی جماعت کا اضافہ کیا گیا۔

۱۸۲۹ء کی رپورٹ کے مطابق نواب اعتماد الدولہ سید فضل علی خاں بہادر وزیر بادشاہ اودھ نے ایک لاکھ ستر ہزار روپے کی رقم دے کر اس کالج کا ایک ٹرسٹ قائم کیا۔

۱۸۳۵ء سے پہلے ہندوستان کے تقریباً تمام مدرسوں میں عربی، فارسی اور سنسکرت کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ان مدرسوں میں ہندوستانی زبانوں کا کوئی مقام نہیں تھا۔ کچھ عرصے بعد انگریزی حکومت کی پالیسی کے تحت عربی اور سنسکرت کی اہمیت بہت کم رہ گئی اور ہندوستانی زبانوں کو تو خیر کوئی پوچھنے والا تھا ہی نہیں۔ لیکن پورے ملک میں دہلی کالج وہ واحد کالج تھا۔ جہاں ہیئت، ریاضی، فلاسفی اور تاریخ جیسے مغربی علوم کی تعلیم اردو کے ذریعے دی جاتی تھی۔ ایک پریشانی یہ تھی کہ اردو کے ذریعے مغربی تعلیم کو حاصل کرنے والوں کے لیے اردو نصابی کتابیں نہیں تھیں۔ برطانوی حکومت

نے ۱۸۳۵ء میں ایجوکیشنل کمیٹی قائم کی تاکہ وہ نصابی کتابوں کے مسائل کو حل کر سکے۔ اس کمیٹی کا قیام ہونے سے بہت پہلے اسکول بک سوسائٹی نام سے ایک ادارے نے مدرسوں کے لیے اردو میں بہت سی کتابیں تیار کر کے شائع کی تھیں۔ نصابی کتابوں کا طبع زاد تیار کرنا بہت مشکل تھا۔ ہاں! یہ ممکن تھا کہ انگریزی کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کر دیا جاتا۔ چناں چہ ۱۸۴۱ء میں ایک سب کمیٹی تشکیل دی گئی جس نے اردو میں تراجم کی طرف توجہ دی۔ لیکن کمیٹی نے کوئی خاص کام انجام نہیں دیا۔ کچھ عرصے بعد دہلی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی وجود میں آئی۔ اس سوسائٹی کا مقصد یہ تھا کہ ترجموں یا جدید موضوعات پر کتابوں کی تالیف کے ذریعے ہندوستانی زبانوں میں نصاب کی کتابیں فراہم کی جائیں۔ اس کے مقاصد حسب ذیل تھے:

۱۔ انجمن کا یہ منشا ہے کہ انگریزی، سنسکرت، عربی، فارسی کی اعلا درجے کی کتابیں اردو، بنگالی ہندی میں ترجمہ کی جائیں اور سب سے اوّل دیسی زبان کی درسی کتابیں تیار کی جائیں۔

۲۔ اگرچہ امید نہیں کہ ابتدائی ترجمے اعلا درجے کے ہوں لیکن یہ توقع کی جاتی ہے کہ اگر ان کے استعمال اور سرپرستی کی مسلسل اور باقاعدہ کوشش کی گئی تو دیسی زبانوں میں بہت کچھ ترقی ہو جائے گی۔

۳۔ ترجمہ اگر اس درجے کا بھی نہ ہوا جیسا کہ ہونا چاہیے مگر سمجھ میں آسکتا ہے اور صحیح بھی ہے تو انجمن اپنی بساط کے موافق اس کی سرپرستی کرے گی۔ ابتدا میں چوں کہ قلیل تعداد میں اس کے نسخے چھپوائے جائیں گے اور آیندہ طبع کے موقعوں پر اس میں اصلاح ہوتی رہے گی لیکن اگر اس اثنا میں اس کتاب کا کوئی بہتر ترجمہ ہو گیا تو پھر پہلے ترجمے کا چھپوانا موقوف کر دیا جائے گا۔

۴۔ دیسی زبانوں کی مفید جدید تالیفات اور انگریزی، سنسکرت، عربی کی اعلا کتابوں کے ترجموں کے مسودے بہ شرح ۶ آنے تا یک روپیا فی صفحہ (حسب تالیف یا ترجمہ) خریدے جائیں گے فارسی کتاب یا کسی دیسی زبان کا ترجمہ (دوسری دیسی زبان میں) اس سے نصف شرح پر خریدا جائے گا۔[1]

---

[1] نظر ثانی کے لیے یہ شرح بعد میں تجویز ہوئی، ابتدائی تاریخی اور ادبی کتابوں کے لیے فی صفحہ چھ آنے، سائنس قانون یا فلسفے کے لیے فی صفحہ دس آنے۔

۵۔ قاعدہ بالا کی رو سے جو ترجمہ انجمن خریدے گی۔ اس کا حقِ تالیف (بشرطیکہ کوئی اور معاہدہ نہ کیا گیا ہو) انجمن ہی کا ہوگا۔

۶۔ قاعدۂ بالا کا اطلاق ملکی السنہ کی جدید تالیفات یا جدید اعلا کتاب کے ترجمے پر، جو اصل کتاب کے طبع سے تین سال کے اندر کیا گیا ہو، نہ ہوگا۔

۷۔ ترجموں کے مفید ہونے نہ ہونے کا فیصلہ انجمن کی مجلسِ انتظامی کرے گی اور سب سے اوّل وہ اپنا سرمایہ ان کتابوں کی طبع پر صرف کرے گی جو نہایت ضروری ہیں۔

۸۔ انجمن طبع کے لیے ابتدا میں عموماً ایسی کتابیں خریدے گی۔ جن کا حجم چار سو پانسو صفحات سے زیادہ نہ ہوگا۔

۹۔ انجمن اپنی کتابیں جہاں تک ممکن ہوگا سستی بیچے گی اور طبع کے اخراجات کا ایک حصہ اور بعض صورتوں میں تمام اخراجات انجمن اپنے سرمایے سے ادا کرے گی۔

ڈاکٹر عبدالحق نے تفصیل کے ساتھ وہ قواعد پیش کیے ہیں جو سوسائٹی نے انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنے کے لیے وضع کیے تھے۔ قواعد حسبِ ذیل ہیں:

۱۔ جب سائنس کا کوئی ایسا لفظ آئے جس کا مترادف اردو میں نہ ہو، مثلاً سوڈیم، پوٹے سیم کلورین وغیرہ تو ایسے لفظ کو بجنسہٖ اردو میں لے لینے میں کوئی حرج نہیں۔ یہی قاعدہ ایسے خطابات والقاب کے بارے میں بھی مدِنظر رکھا جائے جن کے مساوی خطابات والقاب ہندوستان کی تاریخ میں نہیں پائے جاتے۔ مثلاً بشپ، ڈیوک ارل، کلکٹر وغیرہ۔

۲۔ اگر سائنس کا کوئی لفظ ایسا ہے جس کا مترادف اردو میں پایا جاتا ہے تو اردو لفظ ہی استعمال کرنا چاہیے۔ جیسے آئرن کے لیے لوہا، سلفر کے لیے گندھک، منسٹر کے لیے وزیر، ٹمن کے لیے طلب نامہ۔

۳۔ اگر لفظ مرکب ہے اور ہر دو لفظ انگریزی ہیں اور دونوں میں سے کسی کا مترادف اردو میں نہیں تو وہ لفظ بجنسہٖ اردو میں منتقل کر لیا جائے جیسے ہائڈروکلورک، کیوں کہ ہائڈروجن اور کلورائن میں سے کسی کا مترادف اردو میں نہیں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ پورے انگریزی جملے کو بجنسہٖ اردو میں لے لیا جائے بلکہ اسے اردو میں ادا کرنے کی

کوشش کی جائے۔ مثلاً جسٹس آف دی پیس کو اردو میں جسٹس پیس کی اور ملٹری آرڈر آف دی باتھ کو لشکری جماعت باتھ کی اور ملٹری اینڈ ریلیجس آرڈر آف ماٹا کو لشکری و مذہبی جماعت ماٹا کی، ترجمہ کیا جائے۔

۴۔ اگر لفظ مرکب ہے اور اردو میں اس کا مترادف نہیں، مگر الگ الگ لفظ کے مترادف اردو میں موجود ہیں تو یا تو ان دونوں لفظوں کو ملا کر یا کسی دوسرے مساوی مفہوم کے الفاظ میں ترجمہ کر لیا جائے۔ مثلاً کرانولوجی Chronology کا ترجمہ علمِ زماں۔ ہاؤس آف لارڈز کا کچہری امیروں کی، ہاؤس آف کامنز کا کچہری وکلائے رعایا کی یا صرف کچہری وکلا کی۔

۵۔ جب یہ قاعدہ یا قاعدہ ذیل آسانی سے مطابق نہ ہو تو پھر غیر زبان کا لفظ اردو میں لے لیا جائے جیسے ہائڈروجن، نائٹروجن۔

۶۔ اگر مرکب لفظ ایسے دو مفرد الفاظ سے بنا ہے۔ جن میں سے ایک کا مترادف اردو میں موجود ہے مگر دوسرے کا مترادف نہیں تو ایک انگریزی اور دوسرے اردو سے مرکب بنا لیا جائے۔ جیسے کورٹ آف ڈائرکٹر کا ترجمہ کچہری ڈائرکٹروں کی۔ آرچ بشپ کا۔ بشپ اعلا کر لیا جائے۔

۷۔ بعض لفظ ایسے ہیں جیسے آرڈر order کلاس، جینس Genius اسپیشیز Species جن کے مترادف کسی نہ کسی صورت میں منتقل کر لیے جائیں تو مناسب ہوگا۔ کیوں کہ اردو میں اس قسم کے الفاظ ایک دوسرے کے مترادف ہوتے ہیں اور اس سے ایک دوسرے کے مفہوم کے سمجھنے میں مغالطہ پیدا ہو جاتا ہے۔ حالاں کہ ان الفاظ کے معانی کا امتیاز نیچرل ہسٹری میں بہت اہم ہے۔

درختوں کے انواع (خاندانوں کے) کے نام یا تو اس نوع خاندان کے کسی ممتاز فرد کے نام پر رکھے جاتے ہیں یا اس نوع کی مشترک خاصیتوں کی بنا پر نام رکھ لیا جاتا ہے اس قاعدے کی پابندی اردو میں کی جائے۔ اگر یہ زیادہ آسان اور مفید ثابت ہو کہ ہر نوع (خاندان) کے الگ الگ نام صرف اس کے خاص اور ممتاز افراد پر رکھے جائیں تو

www.kitaabistan.com

پھر سہی کیا جائے۔

اس انجمن نے ترجمہ کرنے والوں کو یہ ہدایت بھی دی کہ جہاں تک ممکن ہو سکے انگریزی الفاظ کا استعمال نہ کیا جائے۔ جو شخص سائنس کی کسی کتاب کا ترجمہ کرنا چاہتا ہے۔ اسے چاہیے کہ پہلے سے ترجمہ کی ہوئی کتابوں کو سامنے رکھے۔ ان میں جو لفظ اور اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں، انھیں ہی استعمال کرے۔ یہ بھی ہدایت دی گئی کہ ترجمہ کرنے والوں کو لفظ بہ لفظ ترجمہ نہیں کرنا چاہیے۔ اسے اصل عبارت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ پھر صاف، سلیس اور شگفتہ زبان میں اسے بیان کر دینا چاہیے۔ کیمسٹری کی اصطلاحات کے متعلق یہ ہدایت دی گئی۔ کیمسٹری کی اصطلاحوں کو اردو میں جوں کا توں لے لینا چاہیے۔ البتہ جن کیمیائی عناصر کے اردو میں نام موجود ہیں، انھیں ویسے ہی استعمال کرنا چاہیے۔ ہاں کوئی اصطلاح مرکب ہو یعنی دو لفظوں سے مل کر بنی ہو تو وہ دونوں لفظ انگریزی کے ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ ایک لفظ اردو کا ہو اور دوسرا انگریزی کا۔

اگرچہ یہ سوسائٹی اس لیے قائم ہوئی تھی کہ انگریزی، عربی، سنسکرت اور فارسی زبانوں کی اعلا اور بہترین کتابیں اردو، بنگالی اور ہندی میں ترجمہ کرے لیکن یہ کام صرف اردو زبان ہی میں ہو سکا۔

ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے اپنی کتاب "مرحوم دہلی کالج" میں اس ادارے کی ۱۲۸ کتابوں کی فہرست دی ہے۔ اس فہرست میں ترجمے بھی ہیں اور طبع زاد کتابیں بھی اور بقول ڈاکٹر مولوی عبدالحق

"اس میں ذرا شبہ نہیں کہ اردو کو علمی زبان بنانے کی یہ پہلی سعی تھی جو خاص اصول اور قاعدے کے ساتھ عمل میں آئی۔"

اردو کے نثری تراجم کے سلسلے میں انجمن ترقی اردو کا ذکر بھی ضروری ہے۔ ۱۹۰۳ء میں مسلم ایجوکیشن کانفرنس کے شعبے کے طور پر انجمن ترقی اردو وجود میں آئی۔ اس کا مقصد اردو زبان اور ادب کی ترقی اور فروغ تھا، اس کے پہلے صدر پروفیسر تامس آرنلڈ اور سکریٹری علامہ شبلی تھے۔ علامہ شبلی اور بعد کے سکریٹری مولوی عبدالحق نے خاصی تعداد میں ترجمے کیے۔

یورپین زبانوں، عربی، فارسی اور سنسکرت سے خاصی تعداد میں ادبیاتِ عالیہ کا ترجمہ کیا گیا انجمن نے ۱۹۲۱ء میں اصطلاح سازی کے فن پر مولوی سید وحیدالدین سلیم کی "وضع اصطلاحات" نام سے ایک کتاب شائع کی۔ اس موضوع پر یہ اردو کی پہلی کتاب ہے۔ پچھتر سال گزرنے کے باوجود اس موضوع پر کوئی دوسری کتاب نہیں چھپی۔

دارالترجمہ عثمانیہ

حیدرآباد دکن کے اسکولوں میں میٹرک اور انٹرمیجیٹ تک ذریعۂ تعلیم اردو تھا۔ ہندستان میں اردو کے ذریعے مختلف علوم کی تعلیم کا یہ پہلا تجربہ تھا، جو غیر معمولی طور پر کامیاب رہا۔ کہا جاتا ہے کہ مولوی عبدالحق نے حیدرآباد میں ایک ایسی یونیورسٹی کے قیام کی تجویز پیش کی جس کا ذریعۂ تعلیم اردو ہو۔ سر اکبر حیدری اور سر راس مسعود نے لگاتار پُرخلوص کوششوں سے حیدرآباد کے نواب میر عثمان علی خاں کو اردو ذریعۂ تعلیم کی یونیورسٹی قائم کرنے پر راضی کر لیا۔

۲۶ اپریل ۱۹۱۷ء کو نظام حیدرآباد نے عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کی منظوری دے دی یونیورسٹی کے قیام کے فوراً بعد ہی مختلف علوم میں اردو کی نصابی کتابوں کی ضرورت محسوس کی گئی چناں چہ نظام حیدرآباد نے ۱۴ اگست ۱۹۱۷ء کو شعبۂ تالیف و ترجمہ کے نام سے دارالترجمہ قائم کیا۔ اس ادارے میں آرٹس کے تمام مضامین میں ایک ایک اور سائنس کے مضامین میں دو دو مترجمین کا تقرر کیا گیا۔ یہ مترجمین انگریزی، عربی، فارسی اور اردو پر قدرت رکھتے تھے تقرر کے وقت یہ خیال رکھا گیا کہ مترجم دونوں زبانوں پر (یعنی جس زبان سے ترجمہ کیا جا رہا ہے اور جس زبان میں ترجمہ کیا جا رہا ہے) پورا عبور رکھتا ہو۔ ہندوستان کے مختلف حصوں سے ترجمے کے لیے ماہرین کو دعوت دی گئی۔ ابتدا میں جن لوگوں کا تقرر کیا گیا ان میں قاضی محمد حسین، قاضی تلمذ حسین، محمد الیاس برنی، سید ہاشمی فرید آبادی، چودھری برکت علی نظم طباطبائی عبداللہ عمادی، سید علی رضا، عبدالحلیم شرر، بلدیو سنگھ، وحیدالدین سلیم، مولوی عنایت اللہ حبیب الرحمان خاں، خلیفہ عبدالحکیم، مولوی احسان احمد، مولوی عبدالباری، مرزا محمد ہادی رسوا

پروفیسر ضیا الدین انصاری وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

اس ادارے نے مختلف درجوں کے نصاب کے لیے لگ بھگ ساڑھے چار سو کتابیں تیار کیں۔ ان کتابوں میں ۲۹ تالیفات تھیں اور باقی ترجمہ۔ تین سو انتیس کتابیں انگریزی سے، اکہتر عربی سے، سترہ فارسی سے، چھ جرمنی سے، اور پانچ فرانسیسی سے ترجمہ کی گئی تھیں۔

افسوس ہے کہ آزادی کے بعد جب حیدرآباد ریاست کا الحاق کیا گیا تو اس یونیورسٹی کا ذریعۂ تعلیم بدل دیا گیا۔ پولس ایکشن میں دارالترجمے کی عمارت کو آگ لگادی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو کا بیش بہا خزانہ نذرِ آتش ہوگیا۔

آزادی کے بعد مرکزی حکومت نے ترقی اردو بورڈ کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا۔ اس ادارے کا بنیادی مقصد اعلا تعلیم کے لیے نصابی کتابوں کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ تھا۔ یہ ادارہ اب تک پانچ سو سے زائد ترجمے شائع کرچکا ہے۔ اس ادارے نے مختلف علوم کی اصطلاحیں بھی تیار کی ہیں۔

اردو میں ترجمہ نگاری کی تعریف میں سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی، غازی پور، انجمنِ پنجاب، لاہور، دارالمصنفین، علی گڑھ وغیرہ بھی قابل ذکر ہیں۔ طوالت کی وجہ سے ان اداروں کے کارناموں کی تفصیل نہیں بیان کی جاسکتی۔ جو حضرات ان اداروں کے کام سے واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہیں، انھیں ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کی مغرب سے نثری تراجم کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

ماآخذ

۱۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، ادبیاتِ فارسی میں ہندوؤں کا حصہ، نئی دلی، ۱۹۹۲ء

۲۔ عبیدہ بیگم، فورٹ ولیم کالج، لکھنؤ، ۱۹۸۳ء

۳۔ عطش درانی، اردو اصطلاحات سازی، اسلام آباد، ۱۹۹۳ء

۴۔ محمد عتیق صدیقی، گل کرسٹ اور اس کا عہد، نئی دہلی، ۱۹۷۹ء

۵۔ مولوی عبدالحق مرحوم دہلی کالج، نئی دلی۔ ۱۹۸۹ء

۶۔ مولوی وحید الدین سلیم، وضعِ اصطلاحات، اورنگ آباد، ۱۹۲۱ء

۷۔ مختار احمد قریشی، ترجمہ: روایت اور فن، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء

۸۔ مرزا حامد بیگ، مغرب سے نثری تراجم، اسلام آباد، ۱۹۸۸ء

www.kitaabistan.com

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ

ترجمے کی ضرورت

عام طور پر دنیا بھر میں ترجمہ چار وجوہات کی بنا پر ہوا۔

۱۔ مذہبی تقاضوں کے سبب پیغامِ الٰہی کی نشر و اشاعت کی صورت میں ہمارے ہاں سیرام پور کے عیسائی مشنریوں اور شاہ عبدالقادرؒ دونوں کا ترجمے کے بارے میں مقصد اور نقطۂ نظر یکساں تھا، وہ ایک عام آدمی تک خدا کا کلام اور پیغام خود ان کی زبان میں پہنچانا چاہتے تھے۔ ترجمے کی ایسی ضرورت جو اس ضمن میں نظر آتی ہے خالصتاً مذہبی تقاضوں سے پیدا ہوتی ہے اور پیغامِ الٰہی کی نشر و اشاعت کا ذمہ لیتی ہے۔

۲۔ قومی سطح پر ترقی یافتہ اقوام کے علوم و فنون و ادبیات سے واقفیت حاصل کرنے کی خاطر اس باب میں ڈاکٹر عبدالحق لکھتے ہیں:

'جس طرح یونان کا اثر روما اور دیگر اقوامِ یورپ پر پڑا، جس طرح عرب نے عجم کو اور عجم نے عرب کو اپنا فیض پہنچایا، جس طرح اسلام نے یورپ کی تاریکی اور جہالت کو مٹا کر علم کی روشنی پہنچائی، اسی طرح آج ہم بھی بہت سی باتوں میں مغرب کے محتاج ہیں۔ یہ قانونِ عالم ہے۔ جو یوں ہی جاری رہا اور جاری رہے گا۔ دیے سے دیا جلتا رہا ہے'

جب کسی قوم کی نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے اور وہ آگے قدم بڑھانے کی سعی کرتی ہے تو ادبیات کے میدان میں پہلی منزل ترجمہ ہوتی ہے[۲]

۱۔ ترجمۂ قرآن، مطبوعہ: الٰہ آباد مشن پریس، طبع اول: ۱۸۴۴ء

۲۔ 'مقدمات' حصہ دوم انجمن ترقی اردو ص ۳۰۲

۳۔ گھٹن کے خلاف، تازہ ہوا کی جستجو بقول ڈاکٹر سہیل احمد خاں:

'پابندیوں کے زمانے میں ایسے افسانوں اور ایسی نظموں کے تراجم زیادہ ہونے لگتے ہیں۔ جن میں پابندیوں کے خلاف باغیانہ لہجہ یا جبر کا احساس نمایاں ہو۔ ایسی صورت میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ بہت سے ادیبوں کی یہ روحانی ضرورت بن گئی ہے یا وہ شعوری طور پر تہذیبی اور سماجی صورتِ حال کے پس منظر میں ایک خاص نوع کی تخلیقات سے دل چسپی رکھنے پر مجبور ہیں۔ وہ باتیں جنھیں وہ خود بیان نہیں کر سکتے انھیں ترجموں کی زبان سے ادا کر رہے ہیں۔ اس طرح کے تراجم خود ان ادیبوں کے گرد کھڑے جبریت کے حصار کو کسی حد تک توڑتے ہیں اور قاری بھی صورتِ حال کے بعض کوائف کو ان میں پہچان کر ایک حد تک ان کے ذریعے جبر و احتساب کی فضا سے نکل آتا ہے۔ اس لحاظ سے ان تراجم کا جواز اصل تخلیقات کے بعض موضوعات میں پوشیدہ ہوتا ہے'[۱]

۴۔ اردو میں ترجمہ کی ضرورت بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ یہاں انگریزی سرکاری اور تعلیمی زبان رہی۔ آزادی کے بعد اردو زبان کو اپنی حیثیت منوانے کے لیے اور بالخصوص اپنی زبان ہی کا سہارا لے کر ترقی کی منازل طے کرنا تھیں۔ اس لیے ضرورت محسوس کی گئی کہ سرکاری، تعلیمی، علمی اور ادبی امور کے لیے دنیا بھر کی زبانوں سے اردو میں تراجم کیے جائیں۔ تاکہ ایک تو اردو کے علمی ادبی سرمایہ میں اضافہ ہو سکے، دوسرے دفتری، عدالتی اور سرکاری امور کو جلد از جلد اردو میں انجام دیا جا سکے۔

ترجمے کی اقسام

جہاں تک ترجمے کی مختلف اقسام کا تعلق ہے، ان میں حسبِ ذیل بنیادی حیثیت کی حامل ہیں:

۱۔ بحوالہ: ادبی ترجمے کے مسائل، مشمولہ: طرزیں، قومین مول چند سٹریٹ، لاہور ۱۹۸۲ء

www.kitaabistan.com

۱۔ علمی ترجمہ،
۲۔ ادبی ترجمہ،
۳۔ صحافتی ترجمہ،

اسی طرح ترجمہ کی تین راہیں ہیں:

۱۔ لفظی ترجمہ،
۲۔ آزاد ترجمہ،
۳۔ معتدل ترجمہ/تخلیقی ترجمہ،

اس تیسرے یا اعتدال کے ترجمے کو ہم تخلیقی ترجمہ بھی کہہ سکتے ہیں اس لیے کہ جب اس کی تمام شرائط پوری ہو جاتی ہیں تو وہ صرف تقلید یا نقل نہیں رہ جاتا بلکہ اس میں ایک اپنا فنی حسن پیدا ہو جاتا ہے۔ بقول ظ۔ انصاری،

خیال اور مفہوم کو اس کے باریک سے باریک پیچ و خم کے ساتھ ادا کرنے کے لیے ترجمہ کرنے والے کو مصنف کے ساتھ اس طرح چلنا چاہیے جیسے سوشلسٹ انقلاب کی راہ میں محنت کشوں کو انقلابی پارٹی کے ساتھ چلنا ہوتا ہے کہ قدم سے قدم بھی ملتے رہیں اور آگے نکل جانے یا پیچھے چھٹ جانے کا بھی امکان نہ رہے[۱]

یہ صورت لفظی یا آزاد ترجمے میں پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔

علمی ترجمہ

اس ذیل میں تمام سائنسی علوم و فنون کی کتابیں آتی ہیں۔ علمی ترجمہ عام طور پر لفظی ترجمے کی ذیل میں آتا ہے۔ اس میں اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ جس کسی لفظ یا اصطلاح کا جو ترجمہ ایک جگہ کیا جاتا ہے وہ ان معنوں میں ہر جگہ استعمال کیا جائے، تاکہ ترجمے میں

۱۔ بحوالہ: 'ترجمے کے بنیادی اصول' مطبوعہ: 'ادبِ لطیف'، لاہور اگست ۱۹۵۳ء

یکسانیت برقرار رہے اور قاری کا ذہن کہیں بھی الجھنے نہ پائے۔

علمی تراجم میں اہم مسئلہ علمی اصطلاحات کے مترادفات ڈھونڈنے کا ہوتا ہے۔ علمی اصطلاحات وضع کرتے وقت اس امر کا بالخصوص خیال رکھا جانا چاہیے کہ اصطلاحیں مسلمہ اصولوں کے عین مطابق ہوں، نیز لاطینی، یونانی اور دوسرے سابقوں اور لاحقوں کے ترجمے/مترادفات میں یکسانیت کو ملحوظ خاطر رکھا جائے۔ جہاں تک علمی اور فنی تراجم کا تعلق ہے، ضروری ہے کہ متعلقہ مضمون (علم و فن) کا ماہر ہی یہ کام انجام دے۔ اس کا سب سے بڑا سبب اور ضرورت یہ ہے کہ ہر علم و فن میں اصطلاح کا مضمون سے متعلق اپنا مفہوم ہوتا ہے جو دوسرے علوم و فنون میں نہیں ہوتا مثلاً 'ثقافت' کا لفظ عمرانیات میں کچھ اور معنی دیتا ہے اور فنون میں اس کا کچھ اور مفہوم متعین ہے جب کہ لغت میں اس کے متعدد معنی درج ہیں۔ عملی سطح پر اس کی ایک بہترین مثال مولانا ظفر علی خاں کا ترجمہ 'معرکۂ مذہب و سائنس' ہے۔ اس ترجمے میں۔ بقول ڈاکٹر عبدالحق:

'ایک تو علمی اصطلاحات و علمی مباحث، دوسری زبان کی خوبی و فصاحت اور اردو کی بے بضاعت زبان میں ان دونوں کو قائم رکھنا بہت دشوار تھا'[۱]

تاریخ و ثقافت سے متعلق سید علی بلگرامی کے تراجم 'تمدن ہند' اور 'تمدن عرب' از گستاؤلی بان کا شمار اسی ذیل میں ہوگا۔ اسی نوع کے ترجمے کی بابت جیلانی کامران لکھتے ہیں:

'غیر ادبی تصانیف کا ترجمہ دراصل ایک زبان کی لسانی موت سے پیدا ہوتا ہے اور دوسری زبان کی لسانی افزائش کا باعث بنتا ہے۔ 'لسانی موت' کی ترکیب قابل غور ہے۔ میں نے اسے استعارۃً استعمال کیا ہے۔ کیوں کہ ہم جس زبان سے ترجمہ کرتے ہیں اس کے الفاظ ہمیں عزیز نہیں ہوتے اور نہ ہمیں اس کی لسانی خوبیوں سے کوئی تعلق ہوتا ہے۔ ہمیں لفظوں کی شکل و صورت، ان کے تلفظ اور ان کے حسن اور موسیقی سے کوئی دل چسپی نہیں ہوتی۔ دل چسپی ہوتی

۱۔ 'مقدمات' حصہ اول، انجمن ترقی اردو ص ۵۴

ہے تو صرف اس شے سے جو لفظوں کا لباس پہنے لفظوں کے پرے کسی طلسمی راز کے طور پر موجود ہوتی ہے۔ ہم اسے برآمد کرنے اور اپنی زبان میں کامیابی اور ایمانداری سے منتقل کرنے کے لیے الفاظ کے سب ناطے اور اصل زبان کے سلسلے فراموش کر دیتے ہیں اور یوں سمجھتے ہیں کہ اصل زبان مر چکی ہے اور ہم اس کے جادو سے اپنی زبان کو زندہ کرنا چاہتے ہیں۔[1]

ادبی ترجمہ:

اس نوع کے ترجمے کے لیے ضروری ہے کہ بامحاورہ کیا جائے اور اپنی زبان کے روزمرہ تشبیہات ضرب الامثال، استعارات و کنایات اور رموز و علامات سے کام لیا جائے تاکہ ترجمے میں ادبی رنگ آجائے اور ترجمہ طبع زاد سے کم تر دکھائی نہ دے۔

اس باب میں اے کے بروہی لکھتے ہیں:

'The art of translation, let me put it as clearly as I can, is not based on mechanical law of caugation but on the law of personal sympathy, it is a human transaction.

یوں ادبی ترجمے میں مترجم اپنے خیال، اپنے وجود، اپنے جذبے، اپنی انا پیشگی اور اپنے قلم کو اصل مصنف کے تابع کر دیتا ہے۔ صرف اس خیال سے کہ اگر فلاں بات اور فلاں عبارت مصنف کو ہماری زبان میں لکھنا ہوتی تو وہ کس طرح لکھتا۔ جس طرح اصل مصنف دوسری زبان میں اسے لکھتا، ترجمے میں بعینہٖ ویسا لکھنے کا جتن کیا جاتا ہے۔

سو باتوں کی ایک بات کہ ادبی ترجمے کے لیے ادبیت کا حامل ہونا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں مزید بحث آگے آئے گی۔

---

[1] بحوالہ: 'ترجمے کی ضرورت' مشمولہ: تنقید کا نیا پس منظر' مطبوعہ لاہور

[2] "Importance and value of translation in literature.

صحافتی ترجمہ

اسے کھلا ترجمہ بھی کہا جاتا ہے۔ اس نوع کا ترجمہ مفہوم کے ترجمے کی ذیل میں آتا ہے بقول ڈاکٹر مسکین حجازی:

'مفہوم کا ترجمہ کرنا سب سے زیادہ آسان ہے۔ ایسے ترجموں میں کسی پابندی کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ مترجم کے لیے یہ آسانی ہوتی ہے کہ اصل مفہوم سمجھ کر اپنی زبان میں اپنے طور پر بیان کر دے، جس فن کا ترجمہ کرنا مقصود ہو، اگر وہ طویل اور پیچیدہ جملوں پر مشتمل ہو تو لازمی نہیں کہ اس کا ترجمہ بھی اسی طرح طویل اور پیچیدہ جملوں میں کیا جائے۔ بہتر ہے کہ اصل مفہوم کو چھوٹے چھوٹے سادہ جملوں میں ادا کیا جائے'[1]

مولانا عبدالمجید سالک کے نزدیک:

'اخباری ترجمے میں سب سے مقدم مصلحت یہ ہے کہ مطلب بالکل واضح اور عبارت قطعی طور پر سلیس ہو جائے تاکہ تمام پڑھنے والوں کو کوئی الجھن نہ ہو۔ اس کے لیے اپنی زبان کا محاورہ سب سے بہتر رہنما اور معاون ہے۔ اگر اخباری مترجم سادگی سلاست اور محاورہ اردو کو مدنظر رکھ کر ترجمہ کریں تو خود بھی آرام سے رہیں اور پڑھنے والوں کے ذہن بھی نہ الجھیں۔ ان کو چاہیے کہ جہاں انگریزی کے فقرے کی ترکیب پیچیدہ اور طویل پائیں وہاں اس کی چیر پھاڑ کر دیں اور ترجمہ کرنے کے بعد ایک دفعہ پڑھ کر دیکھ لیں کہ آیا اصل مطلب ادا ہو گیا ہے۔ اگر یہ پہلو سے مطلب ادا ہو گیا ہو تو بحمداللہ ورنہ ادھر اُدھر کمی بیشی کر کے اسے پورا کر دیں ڈکشنری مترجم کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ اور اس سے ہر ممکن مدد لینی چاہیے اور کبھی اس غلط فہمی میں نہ رہنا چاہیے کہ ہم بڑے انگریزی دان اور بڑے

---

[1] بحوالہ: 'فن ادارت' مطبوعہ لاہور ص ۲۹۳

اردو خواں ہیں۔ کیوں کہ ممکن ہے وقت پر کسی لفظ کا صحیح اور موزوں ترجمہ نہ سوجھے اور ڈکشنری دیکھنے سے ایسا نفیس لفظ ہاتھ آجائے جو فقرے میں جان ڈال دے۔[1]

چوں کہ ابتدا میں زیادہ تر سروکار انگریزی سے تھا۔ اس لیے صحافتی / اخباری ترجموں کے سبب ایک مخصوص صرف و نحو اور اسلوب کا بھی اردو پر اثر انداز ہونا لازمی تھا۔ اس سلسلے میں سید ہاشمی فرید آبادی لکھتے ہیں:

> اردو ترجمے میں ابتری اور اس کی بدولت خود زبان کی فصاحت میں خرابی کا ایک سبب اردو روزنامے ہوئے۔ جن میں سے زیادہ تر انگریزی سے اطلاعات اور تار کی خبریں بہت جلدی میں ترجمہ کی جاتی ہیں۔ ان کی زبان اور طباعت بھی، سخت اصلاح کی محتاج ہے صاف اور بامحاورہ زبان میں ترجمہ کرنے والے مشاق مترجم ابھی تعداد میں کم اور جینگے ہیں۔[2]

ہمارے ہاں صحافتی / اخباری تراجم جیسے بھی ہوئے ہوں، ان سے اتنا ضرور ہوا کہ ہماری زبان صاف ہوگئی اور اس کے بیانیہ نے ترقی کی۔ یہاں تک کہ مولانا ظفر علی خاں جیسے نادرِ روزگار صحافی پیدا ہوئے۔ ظفر علی خاں نے بیسیوں سیاسی، معاشرتی رہن سہن کی اور علمی اصطلاحیں وضع کیں۔ جن میں سے بعض انتہائی بھاری بھرکم اور بعض انتہائی برجستہ اور ہلکی پھلکی تھیں۔ لیکن ان کے زورِ قلم نے ہر دو اقسام کی وضع کردہ اصطلاحات (اخباری) کو عام کر دیا۔

صحافتی ترجمہ کی بدولت جس کا انداز مقرر کرنے میں مولانا ظفر علی خاں اور مولانا عبدالمجید سالک کا بہت حصہ ہے۔ ہمیں واقعیت، سچی تلی بات کرنے کا سلیقہ، رواں دواں تحریر اور اصلیت سے مطابقت پیدا کرنے کا ڈھنگ آیا۔

چوں کہ اخباری ترجمہ زیادہ بناؤ سنگھار اور خوش بیانی کی بجائے نفسِ مضمون ادا کرنے

---

[1] بحوالہ: 'فن ادارت' از مسکین حجازی ص ۲۹۶

[2] بحوالہ: 'اردو تراجم کا جائزہ' از ضمیر اظہر، مقالہ برائے ایم۔ اے اردو کراچی یونیورسٹی لائبریری بابت سال ۵۵-۱۹۵۴ء

سے متعلق ہے اس لیے اس کا ادبیت سے دور ہونا بھی ایک طرح کی خوبی بن جاتا ہے صحافتی تراجم روزمرہ زندگی سے قریب ہونے کے سبب زبان کو نت نئے الفاظ اور پیشہ وارانہ اصطلاحات بخشتے اور اس میں وسعت پیدا کرتے ہیں۔ یوں بعض اوقات صحافتی ترجمہ بھی تخلیقی ادب پر اثر انداز ہوتا ہے۔

آج کے جدید دور میں اردو صحافت کا ترجمے کے حوالے سے بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ ملک میں اصطلاح سازی اور ان کی معیار بندی کا مرکزی نظام موجود نہیں اور نہ ہی مختلف قومی اداروں کی وضع کردہ اصطلاحات ابھی تک بوجوہ رائج ہو پائی ہیں۔ علاوہ ازیں ایجادات و انکشافات کے اس دور میں تقریباً ہر روز نئے نام اور اصطلاحیں وضع کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ معیار بندی کا مرکزی نظام نہ ہونے کے باعث اخبار میں Space Module کا ترجمہ ایک اخبار میں قمری گاڑی، چھپتا ہے تو دوسرے میں خلائی گاڑی، تیسرے میں مہتاب پر چلنے والی گاڑی، اور چوتھے میں چاند گاڑی۔

یہ اس لیے ہے کہ اخبارات میں ترجمہ پر مامور عملے کی راہنمائی کے لیے نہ تو کوئی نظام ہے اور نہ ہی کوئی ادارہ۔ ٹیلی پرنٹر اور تار سے جو عبارت ذرائع ابلاغ کے دفاتر تک پہنچتی ہے اس میں فرق ہے۔ اس انگریزی عبارت میں ہجوں کی غلطیاں اس کے علاوہ ہوتی ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک ہی جگہ کا نام مختلف اخباروں میں 'خنجر کوٹ'، 'کا بخر کوٹ' اور 'کنجر کوٹ' چھپتا ہے۔ اسم معرفہ کی پہچان سے متعلق یہ مسئلہ 'ٹائم' اور 'نیوز ویک' تک میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

صحافت میں انگریزی سے اردو ترجمہ کرنے کے لیے دونوں زبانوں پر عبور کے علاوہ تاریخ اور جغرافیہ کا علم بھی ضروری ہے تاکہ ہم مردان کو 'مرڈان' Mardan اور ہوتی کو ہوٹی Hoti نہ لکھ دیں۔ اسی طرح مصر انگریزی میں منتقل ہوتا ہے تو Egypt بنتا ہے، لیکن Egypt سے دوبارہ مصر بنانا تاریخ اور جغرافیہ کے علم اور واقفیت عام کے بغیر ممکن نہیں۔ کچھ یہی صورت علوم و فنون، مشاغل اور کھیلوں کی معروف اصطلاحات سے واقفیت نہ ہونے کے سبب پیدا ہوتی ہے۔

www.kitaabistan.com

ترجمہ کون کرے؟

ترجمہ خواہ ادبی ہو یا علمی، اس میں ضرورت ایک ہی قسم کی استعداد کی ہے یعنی حقیقی مناسبت کی تلاش اور وہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ انسان میں غیر معمولی اور تیز بہدف فہم و فراست ہو، جو کسی بات کے مالہ و ماعلیہ کو فوراً بھانپ لے، مفہوم کی سو فیصدی صحیح تشخیص اور تعین کرے اور پھر اسے ویسے ہی برجستہ اور برمحل الفاظ/اسلوب میں ادا کرے۔

اب بحث طلب امر یہ ہے کہ زبان دانی کا معیار کیا ہے اور وہ کونسی کسوٹی ہے جس پر کس کر یہ بتایا جا سکتا ہے کہ کون شخص زبان داں ہے اور کون نہیں؟

دیکھا جائے تو روزمرہ کی بول چال کے معاملے میں اہل زبان اور یگانۂ زبان دلسان نیم تعلیم یافتہ اور فارغ التحصیل سب برابر ہیں۔ جب تک کوئی شخص متواتر اور پے در پے زبان کی نزاکتوں اور اسلوبیاتی نظام پر غور نہیں کرتا اور جب تک اپنے افکار کو مختلف اور گوناگوں انداز سے لفظوں کی معرفت سامنے لانے کی مشق و مزاولت بہم نہیں پہنچاتا، اس وقت تک وہ ترجمے اور تصنیف و تالیف کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ جبکہ ہمارے ہاں ترجمے کے باب میں عام طور پر مترجمین ان صفات سے عاری دکھائی دیتے ہیں مولانا صلاح الدین احمد اپنے ایک ریڈیو کالم میں فرماتے ہیں:

> "ترجمہ نے کر بیٹھ گئے اور ایک زبان کے ایک لفظ کی جگہ دوسری زبان کا اس سے ملتا جلتا لفظ رکھتے ہوئے ایک سیدھی سڑک پر ہو لیے اور جہاں کہیں اس سڑک پر کوئی رکاوٹ نظر آئی اسے طرح دے کر یا چکر کاٹ کر برابر سے نکل گئے۔ اس عمل کے عامل کو اس سے غرض نہیں ہوتی کہ پڑھنے والے کے پلے بھی کچھ پڑا یا نہیں مصنف کی روح کا کوئی ہلکا سا پرتو بھی اس تک پہنچا یا نہیں۔ پھر اس کام میں سوچنے سمجھنے کی کچھ ضرورت نہیں ہوتی، محض ایک ڈکشنری کی حاجت ہوتی ہے۔"

نتیجتاً ہوتا یہ ہے کہ بڑے عجیب و غریب ترجمے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ مثالیں

دیکھیے:

۱۔ وہ ایک خوش نصیب سپاہی تھا — Soldier of Fortune — کا ترجمہ۔

۲۔ وہ ان کو وقتاً فوقتاً ٹالتا رہا ہے — From Time to Time — کا ترجمہ۔

۳۔ برطانیہ اپنے اچھے اچھے دفاتر استعمال کرے گی — Good office — کا ترجمہ۔

۴۔ یہ حکایت اس روح میں نہیں لکھی گئی ہیں جو سعدی میں پائی جاتی ہے — Spirit — کا ترجمہ۔

۵۔ کھیل ڈرامہ کی روح سے خالی ہیں۔ — Plays — اور — Spirit — کا ترجمہ۔

محولہ بالا مثالوں کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ترجمہ کرنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ یہ ایک تخصیصی نوعیت کا کام ہے۔ صرف زبان دانی کی سطح پر اچھے مترجم کی خصوصیات میں جہاں اور بہت سے امور شامل ہیں وہیں زبان کی گرامر، لفظ کی شناخت، روزمرہ، استعارات و کنایات، علامات، تشبیہات، ضرب الامثال اور ان بولیوں/زبانوں سے واقفیت بھی ضروری ہے جن سے اردو زبان کی تشکیل عمل میں آئی ہے۔ اس میں زبان کا مزاج، اسلوبی نظام اور پیرایۂ اظہار کو بھی یکساں اہمیت حاصل ہے۔

اب آیئے ترجمے کے ذریعے تہذیبی فضا کی منتقلی کے الجھیڑوں کی طرف۔ ہمارے ہاں عمومی طور پر مترجمین اس کوشش میں ناکام دکھائی دیتے ہیں اس باب میں ہماری ناکامی کی اصل وجہ درحقیقت یہ ہے کہ ہم نے مغربی زبانوں کے بیشتر ترجمے انگریزی کی معرفت کیے۔ یوں اصل تہذیبی رچاؤ پہلے انگریزی اور پھر اردو میں منتقلی کے بعد کیسے کیا ہو گیا۔

ہمارے عسکری صاحب نے تو مارسل پروست کے انگریزی ترجموں کو بھی مان کر نہیں دیا سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو انگریزی میں منتقل نہیں ہوا وہ انگریزی کی معرفت ترجمہ کر کے کیسے ممکن ہے؟

حق بات تو یہ ہے کہ مارسل پروست کے افسانوی ادب کی فضا سے تو عسکری صاحب واقف تھے لیکن تہذیبی رچاؤ سے واقفیت کا دعویٰ وہ بھی نہیں کر سکتے۔

اس لیے ضروری ہے کہ مترجم جس زبان کے ادب کو اپنی زبان میں منتقل کرنے کا سوچے

پہلے اس زبان کے تہذیبی رچاؤ سے واقفیت حاصل کرے۔

ہمارے ہاں ترجمہ در ترجمہ یہاں تک ہوا کہ صادق ہدایت تک کو یار لوگوں نے انگریزی کی معرفت ترجمہ کیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم نے ترجمہ کرتے وقت 'بڈھا گوریو' لکھا اور اتنی زحمت گوارا نہ کی کہ ہمسایہ ملک ایران میں اسے 'بابا گوریو' ترجمہ کیا گیا تھا، جو فارسی کی طرح اردو میں بھی مناسب تھا۔

اسی طرح اردو مترجم کے لیے ضروری ہے کہ وہ اردو کی ہیئت ترکیبی کا علم رکھتا ہو۔ اس میں چار (۴) چیزوں کو خاص دخل ہے۔

۱۔ اردو زبان کی اصل

یعنی لشکری زبان کا ہونا، اس کا خمیر بہت سی زبانوں سے مل کر اٹھنا، برج بھاشا اور فارسی کا ملاپ، سنسکرت اور پراکرت کا میل اور لفظیات، اردو میں ہندی عناصر کی شد بد، ہندی کے حروف فاعلی، مفعولی، اضافت، نسبت، ربط اور ضمیریں، نیز اس بات کا علم کہ ہر وہ لفظ جو اردو میں کھپ گیا۔ عربی ہو یا فارسی، ترکی ہو یا سریانی، یورپی ہو یا پنجابی/سنسکرت از روے اصل غلط ہو یا صحیح وہ لفظ اردو کا ہے۔ اس لیے اگر وہ لفظ اصل کے موافق ہے تو بھی صحیح ہے اور اگر خلافِ اصل مستعمل ہے تو بھی درست۔

۲۔ لفظ و معنی

اس باب میں صحیح لفظ کے انتخاب میں کاوش اور تلاش میں تگ و دو لفظ کی شخصیت سے کامل آگہی اور مناسب ترین الفاظ، مرکبات اور کلمات کا جویا ہونا۔

۳۔ وضع اصطلاحات کی صلاحیت

اس باب میں وحیدالدین سلیم لکھتے ہیں:

'اگر اصطلاحیں نہ ہوں تو ہم علمی مطلب کے ادا کرنے میں طولِ لاطائل سے کسی

طرح نہیں بچ سکتے۔ جہاں ایک چھوٹے سے لفظ سے کام نکل سکتا ہے وہاں بڑے بڑے لمبے جملے لکھنے پڑتے ہیں اور ان کو بار بار دہرانا پڑتا ہے'[1]

۴۔ مترادفات و مرادفات کا شعور

اس باب میں سید عابد علی لکھتے ہیں:

'لغت کا ذخیرۂ الفاظ بہت محدود ہے اور ذہن انسانی کی پرواز بیکراں۔ اس لیے لغت تو یہ کر سکتی ہے کہ ایک کلمے کے کئی سلسلہ معانی متعین کر دے، لیکن یہ نہیں کر سکتی کہ ایک ہی معنی کے لیے دو لفظ مہیا کر دے۔ جہاں ایسا اشتباہ ہوگا وہاں الفاظ مترادف ہوں گے مرادف نہیں۔ مراد یہ ہے کہ معانی میں قریب تر تو ہوں گے لیکن کوئی دلالت ضرور مختلف ہوگی'[2]

اب آئیں ذرا سرسری طور پر نگاہ کریں کہ ترجمہ کرتے وقت ایک زبان (غیر زبان) کے کن کن عناصر کو اپنی زبان میں ڈھالنا پڑتا ہے:

(۱) اصل/متن کی زبان

۱۔ مفرد الفاظ، اصطلاحات، محاورے۔

۲۔ الفاظ کی نشست و برخاست، صرف و نحو

۳۔ الفاظ کے لفظی و معنوی رشتوں کا شعور۔ صنائع لفظی و معنوی

۴۔ الفاظ، تراکیب اور ان کی لغوی دلالت

۵۔ زبان کا کینڈا اس کی اصل روح

۶۔ عبارت/متن کی ظاہری وضع اور مفہوم

---

[1] وضع اصطلاحات، انجمن ترقی اردو (ہند)، ص ۳

[2] قاری کی شعوری سطح، ادراک، مزاج اور لہجہ

www.kitaabistan.com

۷۔ اسلوبیاتی نظام

۸۔ اصل متن کی روح، نوعیت، جذبات، محاکات اور اس کا آہنگ (باطنی سطح پر)

۹۔ مصنف کا ذوق اور لب و لہجہ

۱۰۔ جملوں کی ساخت

۱۱۔ اس زبان سے مخصوص جوہر خفتہ اور جاگی ہوئی صلاحیتیں، کوتاہیاں، زندہ روایت کا شعور اور ارتقائی خواص۔

۱۲۔ ترجمہ کے لیے اصل متن کی جزوی یا کلی موزونیت یا نامناسبت

۱۳۔ اساطیری نظام اور روایات

۱۴۔ وزن اضافی کا خیال رکھنا۔ یعنی عریاں، برہنہ، اور ننگا جیسے الفاظ میں نازک امتیازات کا خیال رکھنا۔

(۲) مترجم کی زبان

۱۔ قاری کی شعوری سطح، ادراک، مزاج اور لہجہ

۲۔ اپنے معاشرے کی وضع اور خُوبُو

۳۔ اپنے تہذیبی و تمدنی لوازمات

۴۔ مُرادفات

۵۔ صرف و نحو

۶۔ اپنی زبان کا کینڈا، وضع، روایات اور صلاحیتیں

(۳) مترجم کی ذات

۱۔ ترجمے کا ذوق، استعداد، زبانوں پر قدرت، نفسِ مضمون پر گرفت

۲۔ اصل متن اور مصنف سے وفاداری، اس کی نقالی یا بنت کی سطح پر مزید جلا دینا۔

۳۔ اصل متن کی مخصوص وضع کو منتقل کرنے کا جتن۔

۴۔ اصل متن، مصنف یا غیر تہذیب کا باغی نہ ہونا۔

۵۔ اصل سے مرعوب نہیں بلکہ اصل مصنف اور متن کا مطیع ہونا

(۴) ترجمے کی نوع

۱۔ قابلِ مطالعہ ہونا

۲۔ مانوس ہونا

۳۔ رواں اور صاف ہونا

۴۔ ترجمہ پن کا نہ ہونا

فنِ ترجمہ کے اصول و مبادیات

فنِ ترجمہ کی وضاحت اور مشکلات پر تفصیلی بحث کے بعد چند سوالوں کا ذہن میں پیدا ہونا ایک لازمی امر ہے۔ وہ سوال کچھ یوں ہوں گے۔

۱۔ کیا ایک اچھا ترجمہ ہمیشہ تخلیقی ہوتا ہے؟ اگر ایسا ہے تو تخلیق اور ترجمے کی حد بندی کیوں؟

۲۔ اگر ایسا ہے تو علمی کتب اور صحافت سے متعلق تراجم کے معیار کو پرکھنے کا پیمانہ ہوگا؟

۳۔ کیا ترجمے سے مراد متبادل اور مترادف الفاظ کی تلاش ہی ہے؟

۴۔ کیا ترجمے سے محض قاری کی رہنمائی مقصود ہوتی ہے۔ جو دوسری زبان کو نہیں جانتا؟

۵۔ کیا بقول ڈاکٹر لائٹنر، ہمیں ترجمے پر انحصار نہیں کرنا چاہیے اور محض اصل مفہوم سمجھ کر اسے اپنی زبان میں بیان کر دینا چاہیے۔

ان تمام سوالات کے جواب نامور مترجمین نے ترجموں کے ذریعے عملی طور پر فراہم کیے ہیں۔ ارنسٹ فینولوسا، ایزرا پاؤنڈ اور آرتھر ویلی ترجمے کی دنیا کے تین اہم نام ہیں۔ ان کے کام کا جائزہ ترجمے کے ضمن میں ان سوالات کا مجمل جواب دینے کے لیے کافی ہوگا۔

ارنسٹ فینولوسا بوسٹن کا پہلا ادیب اور محقق تھا جس نے کلاسیکی جاپانی ڈرامے کو

www.kitaabistan.com

مغرب سے متعارف کروایا۔ یہ کام ترجمے کی معرفت ہوا۔ ۱۹۱۰ء کے بعد ایزرا پاؤنڈ کا جھکاؤ مشرق کی سمت ہوا اور اس نے مشرقی تہذیبی روایات سے گہرے اثرات قبول کیے۔ اس کا سبب بھی تراجم تھے۔ مشرق کی شعری روایت سے پاؤنڈ کا اوّلین تعارف عمر خیام کے تراجم کی معرفت ہوا۔ یہ فٹز جیرالڈ کی شہرت کی ابتدا تھی۔ پاؤنڈ نے عمر خیام سے جیرالڈ کی معرفت متعارف ہونے کے بعد ہندی، چینی، جاپانی اور بنگلہ زبانوں اور تہذیبوں کی قدیم دستاویزات میں دل چسپی لی۔

یہ تراجم ہی کا اثر تھا کہ پاؤنڈ نے بھگت کبیر کے چند دوہوں کا ترجمہ کرنے کے بعد جب کنٹوز لکھنے شروع کیے تو ان میں کبیر کا مشرقی لحن بھی شامل ہو گیا اور 'بھگت کبیر' کی گونج صاف پہچانی گئی۔

ارنسٹ فینولوسا کی بیوہ رسالہ 'پوئٹری' میں پاؤنڈ کی تحریریں پڑھ کر اس سے حد درجہ متاثر تھی۔ یہی سبب ہے کہ سروجنی نائیڈو کی قیام گاہ پر پاؤنڈ سے ایک اتفاقی ملاقات پر اس نے اپنے مرحوم شوہر کا غیر مرتب کام پاؤنڈ کے حوالے کر دیا۔ اس کے بعد پاؤنڈ چینی شاعری کے ترجموں کی طرف کچھ ایسا آیا کہ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کو کہنا پڑا کہ 'پاؤنڈ نے ہمارے زمانے کے لیے چینی شاعری کو دریافت کیا ہے'[1]

اس 'دریافت' کو نئے زمانے میں مشرق اور مغرب کے درمیان اوّلین مضبوط رابطہ شمار کیا جاتا ہے۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی رہی ہو کہ پاؤنڈ ترجمہ برائے ترجمہ کا قائل نہیں تھا بلکہ اس نے ترجمے کے وسیلے سے ہر دو اطراف کی تہذیبوں کے بطون کا مطالعہ پیش کیا۔ اسی طرح جب اس نے جاپانی ڈرامائی روایت کو انگریزی میں منتقل کرنے کا کام کیا تو اس کے فوراً بعد ڈبلیو۔ بی۔ ییٹس کے منظوم ڈرامے سامنے آئے۔ یہ ترجمے کے حوالے سے پاؤنڈ ہی کے طفیل ممکن ہو سکا۔ ایزرا پاؤنڈ کے خیال میں جو دور تخلیقی ادب کے لحاظ سے عظیم ہوتا ہے وہ ترجموں

---

[1] پاؤنڈ کے اس کام کی ابتدا CATHY کی طباعت سے ہوئی اور اس کے بعد یکے بعد دیگرے پاؤنڈ نے چینی شاعری کے تراجم کے تین مجموعے شائع کیے۔

کے لحاظ سے بھی عظیم ہوتا ہے یا تخلیقی دور ترجمے کے دور کے بعد آتا ہے۔ پاؤنڈ کی رائے میں "اووڈ" کا مترجم گولڈنگ اتنا بڑا شاعر ہے کہ اس کا مقابلہ ملٹن سے کیا جا سکتا ہے۔ پاؤنڈ نے آخری دور میں لکھا تھا:

'اووڈ کے ہاں عظیم حکمت ملتی ہے'[1]

۱۹۳۴ء میں راپالو سے ایک مراسلہ نگار کو پڑھنے کے لیے کتابوں کے نام بتاتے ہوئے اس نے لکھا:

'انگریزی زبان و ادب کا کوئی شعبہ بھی اس کتاب کے بغیر ایک پاکھنڈ ہے'

بقول ولیم وین اوکونر:

'وہ گولڈنگ کے ترجمے کو ملٹن کی لاطینی کی تحقیر کے لیے استعمال کرتا ہے۔ وہ گولڈنگ کے ہمعصر روزمرہ' کا مقابلہ ملٹن کے مبہم اور پرشکوہ الفاظ' سے کرتا ہے۔ اس کے نزدیک ترجمے کا معیار اس لیے گر گیا کہ مترجمین نے اصل کتب کے نفس مضمون سے دل چسپی لینا چھوڑ دی'[2]

جب کہ خود ولیم وین اوکونر کے خیال میں گولڈنگ کے ترجمے میں اگر کوئی کشش ہے تو وہ اس کے بھولپن اور سادگی کی بدولت ہے اگر گولڈنگ عظمت سے محروم رہتا ہے، جیسا کہ ہوتا ہے تو وہ پھر بھی جہاں تک ممکن ہو سکا ایک مشکل بحر سے بڑی عمدگی کے ساتھ عہدہ برا ہوا۔ ولیم وین اوکونر نے پاؤنڈ کے تراجم پر بات کرتے ہوئے بلیکمر کا حوالہ دیا ہے۔ بلیکمر کے نزدیک پاؤنڈ پراپرٹیس کا ترجمہ نہیں کرتا، وہ اس کی باتوں کے انگریزی مترادفات پیش کرتا ہے۔ مثال کے طور پر جب پراپرٹیس یہ لکھتا ہے کہ 'شعر کو یوں رواں ہونا چاہیے، جیسے اسے ایک نازک جھانوے سے ملائم کیا گیا ہو' تو پاؤنڈ لکھتا ہے:

ہمارے جھانووں کو تیار رہنا چاہیے۔ یا جب پراپرٹیس کہتا ہے کہ:

فنون لطیفہ کی دیویوں کے معبد کا راستہ تنگ ہے۔ تو پاؤنڈ لکھتا ہے:

Ezra Pound ، Minnesota Press, Minneapolis U.S.A. 1962

1963

www.kitaabistan.com

فنون لطیفہ کی دیویوں کے معبد کو کوئی شاہراہ نہیں جاتی۔

ایسا کیوں ہے؟ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ ایزرا پاؤنڈ فینولوسا کی کتاب Chinese Written Characters Medium of Poetry کا پروردہ مترجم تھا۔

لیکن پاؤنڈ کے یہ ترجمے امریکی ناقد اور مترجم پروفیسر یپ Yep کو آنکھ نہیں بھائے اس نے Cathy کی مذمت میں ایک کتاب لکھ ماری ہے اور کہتا ہے کہ پاؤنڈ بددیانت مترجم تھا۔ یپ نے پاؤنڈ کو چینی زبان سے نابلد قرار دیا ہے۔ پروفیسر نے انھی نظموں کو دوبارہ ترجمہ بھی کیا ہے جنھیں پاؤنڈ پہلے ترجمہ کر چکا تھا۔ بہت ممکن ہے یپ کے ترجمے پاؤنڈ کی نسبت زیادہ درست ہوں لیکن یہ بات سب مانتے ہیں کہ یپ کے ترجمے پھسپھسے اور شعریت سے یکسر عاری ہیں اور اسی میں پاؤنڈ کی عظمت کا راز ہے۔

آرتھر ویلی (۱۸۸۹ء۔۱۹۶۶ء) کا نام بھی مشرقی ادب (خصوصاً چینی اور جاپانی ادب) کو مغربی ادبی دنیا سے متعارف کروانے والوں میں نمایاں ہے۔ اس نے چینی شاعر Ch'u Yuan کے علاوہ لاتعداد[1] چینی شعرا کے تراجم کیے Ch'u Yuan کی طویل نظم The Great Summons کے ترجمہ کو آج بھی اہم مانا جاتا ہے۔

نثری تراجم کی دنیا میں اس کا سب سے بڑا کارنامہ ... اور کی بادام موراسا کی Lady Muarasaki Shikibu کے جاپانی قصے The Tale of Geniji کا ترجمہ (تقریباً ایک ہزار صفحات) ہے۔ جو بقول ایڈورڈ جی۔ سائیڈن سٹیکر Ed Ward G. Seidensticker

"جاپانی ادب کا عالی ترین رومانی نثری کارنامہ ہے"۔

ایڈورڈ جی۔ سائیڈن سٹیکر[2] نے آرتھر ویلی کے ترجمے کی خرابیاں بھی گنوائی ہیں۔ اس کے بقول آرتھر ویلی نے بعض ابواب (خصوصاً ۳۸واں باب) کا ترجمہ ہی نہیں کیا بلکہ تلخیص کر دی ہے۔

ے[1] More translations from Chinese, by Arthur Waley
Hoti Messrs, George Allen & Unwin, Ltd.

ے[2] سائیڈن سٹیکر نے حال ہی میں اسی ناول کا نیا ترجمہ پیش کیا ہے۔

اس ذیل میں سائیڈن سٹیکر لکھتا ہے:

"The fact remains that the waley translation is very free. He cuts and expurgates very boldly "

(GG"The Tale of Geniji" کے دیباچے سے اقتباس)

یوں سائیڈن سٹیکر کے خیال میں آرتھر ویلی کی حیثیت، برطانوی مترجم خاتون کونسٹنس گارنٹ Constance Garnett کی طرح ہے جس نے تقریباً سارا روسی ادب انگریزی دنیا سے متعارف کروایا لیکن اس کے ترجمے غلط سلط تھے اور اب اس کے کام کی حیثیت محض تاریخی ہے۔

لیکن کیا کیجیے کہ ولیم وین اوکونر نے جب ان تین عظیم مترجمین (یعنی فینولوسا، ایزرا پاؤنڈ اور آرتھر ویلی) کا موازنہ کیا تو لکھا ہے کہ:

'مائینر کے بقول آرتھر ویلی کے جاپان کے نو ڈرامے' مستند اور عالمانہ ترجمے ہیں، جب کہ پاؤنڈ اور فینولوسا کی تالیف (مراد Cathy)، اکثر مقامات پر عالمانہ نظر نہیں آتی اور تاریخی سیاق و سباق کی غلط تفہیم پر مبنی ہے البتہ اس میں کبھی کبھار خوبصورت اقتباسات بھی آجاتے ہیں۔[1]

تو پتا چلا کہ اپنی مخصوص حدبندیوں میں ترجمہ تخلیق بھی ہے اور اس سے جداگانہ طریقۂ کار کا حامل عمل بھی۔ اس میں متبادل اور مترادف الفاظ کی تلاش بھی کی جاتی ہے اور اصل متن کے بطون کی غواصی بھی۔ یوں وہ انجان زبان (اور تہذیب) کے منطقوں میں قاری کی راہنمائی بھی کرتا ہے اور اس کی انگلی تھام کر بھی چلتا ہے۔

اردو میں ترجمے کے بنیادی اصول

ترجمہ کے فن، اقسام، مشکلات اور مترجم کی اہلیت پر بحث کے بعد اردو میں انگریزی سے ترجمے کے جو بنیادی اصول وضع کیے جا سکتے ہیں، ان کی تفصیل درج ذیل ہے:

ے[1] G'Ezra Pound یونیورسٹی آف مینی سوٹا امریکا۔

۱۔ ہر انگریزی لفظ کے لیے ایک ہی لفظ کا چناؤ کیا جائے۔ بشرطیکہ انگریزی الفاظ وزنِ اضافی کے حامل نہ ہوں یعنی انگریزی لفظ کے ایک سے زائد معنی نہ ہوں۔ مثلاً انگریزی لفظ 'ڈیفنس' کے لیے اردو میں دفاع، حفاظت اور تحفظ تین الفاظ برتے جاتے ہیں۔ جب کہ لفظ 'دفاع' میں 'ڈیفنس' کے تمام تر معنی موجود ہیں۔ اس لیے دفاع کو رائج کرنا بہتر ہوگا۔ لیکن یہاں بھی احتیاط کی ضرورت ہے انگریزی لفظ 'ایوارڈ' کا ترجمہ عطیہ بھی ہو سکتا ہے اور 'فیصلہ' بھی۔ لیکن عطیہ اس وقت لکھیں گے جب مفہوم رفتی ہو اور فیصلہ اس وقت جب مفہوم ثالثی ہو

۲۔ کسی انگریزی لفظ کا اردو متبادل جہاں تک ممکن ہو اس قسم کا لفظ منتخب کریں جس سے مشتقات وضع ہو سکیں مثلاً 'ایڈمنسٹریشن' کا ترجمہ 'انتظام' ہو سکتا ہے۔ اس سے ہم تنظیم انتظامی، منتظم، انتظامیہ اور تنظیمی وغیرہ الفاظ مشتق کر سکتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ہمیں بعض مقامات پر انگریزی الفاظ کے لیے مختلف اور متبادل معنویت کے الفاظ مخصوص کرنے پڑتے ہیں۔ مثلاً 'آرگنائزیشن' کے لیے 'تنظیم' اور 'مینجر' کے لیے 'منتظم'۔ نیز اس بات کا خیال رکھنا پڑے گا کہ انگریزی لفظ کے ترجمہ اور اس کے مشتقات کے معنی ایک ہی ہوں۔ مثلاً اگر ہم 'ڈیفنس' کے لیے 'دفاع' کا لفظ رکھیں تو 'ڈیفنس ایریا' کے لیے 'مدفوعہ علاقہ' ہونا چاہیے نہ کہ 'حفاظتی علاقہ'۔

۳۔ وضع اصطلاحات کے ساتھ ساتھ تعینِ اصطلاحات اور اصطلاحات کو مروج کرنے کا جتن انتہائی ضروری ہے جب کہ ہمارے ہاں ایک انگریزی اصطلاح کے مقابلے میں درجنوں اصطلاحات کا چلن ہے۔ اسکول کی سطح پر نصابی کتب میں اصطلاحات کچھ ہیں اور کالج کی سطح پر کچھ، جب کہ یونیورسٹیوں کے نصاب میں طالبِ علم کو ایک بار پھر نئی اصطلاحات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

یوں ایک معیاری سائنسی لغت کی ضرورت ایک عرصے سے محسوس کی جا رہی ہے۔ مناسب ہوگا کہ یہ کام مقتدرہ قومی زبان جیسا ادارہ کرے، جو پاکستان بھر کے حکومتی اداروں میں اس معیاری لغت کو نافذ کرنے میں با اختیار بھی ہو۔

معیاری سائنسی لغت نہ ہونے کے باعث ہوا یہ کہ انگریزی اصطلاح 'واچ گلاس' کا

ترجمہ کرتے ہوئے اسے 'گھڑی شیشہ' کر دیا گیا۔ جب کہ 'واچ گلاس' محض ایک پرکھنے کا شیشہ ہے، اس میں گھڑی قسم کی کوئی شے نہیں ہوتی۔ اسی طرح 'مکسچر' کا ترجمہ 'آمیزش' کیا گیا جو درست نہیں۔

لغت میں 'ایٹم بم' کا ترجمہ 'جوہری بم' ملتا ہے، جو آدھا تو ترجمہ ہے اور آدھا جوں کا توں رکھ دیا گیا۔ 'ایٹم' کا ترجمہ 'جوہر' کرنا بھی درست نہیں اس لیے کہ اس سے مشتقات وضع کرتے وقت 'جوہری' بنے گا۔ جس سے مشکلات بڑھیں گی۔ اس لیے مناسب تھا کہ 'ایٹم بم' کو اردو میں بھی 'ایٹم بم' ہی پڑھا اور لکھا جاتا۔

اسی طرح مضحکہ خیز ترجمے کی ایک مثال 'کاربو ہائیڈریٹ' کا ترجمہ ہماری لغات میں "شکر" ہے۔

۴۔ انگریزی کی فنی اصطلاحات کا ترجمہ کرتے وقت یہ خیال رکھا جائے کہ اردو میں بھی وہ لفظ اصطلاح کی حیثیت رکھتا ہو نہ کی تشریح کی۔ کسی فنی اصطلاح کا مقصد اختصار ہے اور وہ بھی ایسا کہ معنویت سے لبریز ہو۔ نیز اس کا مفہوم مبہم نہ ہونا چاہیے۔

۵۔ اگر کوئی انگریزی اصطلاح اور اس کا اردو متبادل دونوں یکساں طور پر اردو میں مقبول ہوں تو پھر اس میں کوئی حرج نہیں کہ دونوں کو برتا جائے مثلاً مجلس اور کمیٹی وغیرہ۔

۶۔ خواہ مخواہ وضعِ اصطلاحات کے چکر میں نہیں پڑنا چاہیے۔ اصطلاح کی جگہ ایسے موزوں مقامی بول چال کے الفاظ کو جگہ دی جا سکتی ہے جو خاصے مقبول اور عام فہم ہوں، بجائے اس کے کہ کوئی بھونڈی اور مصنوعی اصطلاح کی جائے۔ مثلاً 'برسٹ آف فائر' کو ہمارے فوجی جوان 'پھٹا' کہتے ہیں پھر کیوں نہ مستعمل لفظ ہی رکھ لیا جائے بقول جلیل قدوائی:

'اگر بعض انگریزی الفاظ استعمال میں آ کر ہماری زبان کا جزو بن چکے ہیں جیسے "ٹنکی" تو ان کے ترجمے کی خاص طور پر کیا ضرورت ہے؟ میں نے انجمن کی بڑی ڈکشنری (خود ڈکشنری بھی ایسا ہی لفظ ہے) کی نظر ثانی کرتے وقت ایسے نہ جانے کتنے الفاظ رہنے دیے یا شامل کر دیے۔ مثلاً ایروگرام، کسٹوڈین، ٹیسلی ویژن، تھرمامیٹر، بلاؤز، بلاٹنگ پیپر، مین ہول، پیٹی کوٹ، ایمبولینس، آٹوگراف

باڈی گارڈ، انجکشن، پلاسٹک وغیرہ اور اگر ضرورت نہ ہو تب بھی کر دیا جائے اور ترجمہ کیا بھی جائے تو غیر زبان کے مستعمل الفاظ بھی رہنے دیے جائیں۔ یہ گویا تسلیم شدہ الفاظ میں ایک طرح کا اضافہ ہوگا جو کسی طرح غیر مناسب نہ ہوگا ان الفاظ کو نکال دینا اتنا ہی غیر فطری اور قابلِ اعتراض ہوگا جیسے ہندی والوں کی یہ ضد کہ اردو میں سے فارسی اور عربی کے آئے ہوئے اور برسوں کے مستعمل الفاظ کو چن چن کر خارج کر دیا جائے۔[1]

البتہ یہاں ضرورت اس امر کی ہے کہ اصطلاحوں کا چناؤ کرتے وقت سلینگز کی پہچان کر لی جائے۔ پھر جہاں تک سائنس کے مختلف شعبوں میں نئی انگریزی ٹرمینالوجی کا تعلق ہے تو وہاں وضعِ اصطلاحات غیر ضروری ہے۔ اس لیے کہ جدید عہد میں خصوصی مہارت کے شعبے بہت ہو گئے۔ جہاں تک سائنس کی بین الاقوامی اصطلاحات کا معاملہ ہے تو محض فزکس میں ایٹمی ذروں کے نام پر ترقی یافتہ ملک میں اسی طرح قبول کر لیے گئے جہاں وہ دریافت کیے گئے۔

۷۔ مختصرات کا ترجمہ نہ کیا جائے بلکہ پورے لفظ کا ترجمہ اختیار کیا جائے مثلاً گورنمنٹ کے لیے انگریزی میں Govt. اور لیفٹننٹ کے لیے 'Lt.' لکھا جاتا ہے۔ لیکن ترجمہ کرتے وقت ان کا ترجمہ مکمل صورت میں کیا جائے تاکہ معنی میں کسی بھی نوع کا اشتباہ نہ رہے۔

۸۔ جہاں تک ممکن ہو ہندی اضافت اور حروفِ جار استعمال نہ کیے جائیں۔ مثلاً ٹائم گلاس کا ترجمہ 'ریت گھڑی'۔ بجائے اس کے 'ریت کی گھڑی' ترجمہ کیا جائے۔

اسمائے معرفہ

یہ دو قسم کے ہیں: ۱۔ اسمائے اشخاص ۲۔ اسمائے مقامات

اسمائے اشخاص کے متعلق یہ اصول ہے کہ اصل زبان کے تلفظ کا اتباع ضروری نہیں بلکہ

---

[1] بحوالہ 'مسائل و مباحث' مطبوعہ 'اخبار اردو' کراچی دسمبر ۱۹۸۳ء ص ۲۴

قطع و برید کے بعد اسے اپنی زبان میں ڈھالا جا سکتا ہے۔ مثلاً Ocretes Ptolmy اور Plato Aristotles, بالترتیب ارسطو، بطلیموس، سقراط اور افلاطون کہیں گے۔

اس باب میں ضرورت اس بات کی ہے کہ سب سے پہلے مترجم انگریزی اسمائے اشخاص کو ترجمہ کرتے وقت اس کا صحیح تلفظ معلوم کریں اور دیکھیں کہ ہماری زبان اس تلفظ کی متحمل ہو سکتی ہے کہ نہیں۔ اگر ایسا ممکن ہے تو اصل تلفظ سے بڑھ کر کیا اچھائی ہوگی لیکن اگر ایسا ممکن نہیں تو قطع و برید میں تکلف نہ برتیں۔

انگریزی کے ایسے اسمائے اشخاص جو حروف کے اعتبار سے ثقل ہیں مگر تلفظ کے اعتبار سے قابلِ قبول ہیں۔ ان کو اردو میں لیتے وقت ثقل دور کر دیا جائے مثلاً Vaghan (واگھن) کی جگہ 'وان' اور Pugh 'پگ' کی جگہ 'پیو' کر لیا جائے تو ثقل بھی دور ہو جاتا ہے اور ترجمے سے وفاداری بھی قائم رہتی ہے۔

اب ایسے اسمائے اشخاص کو لیجیے جن کے املا و تلفظ میں کچھ فرق نہیں مگر ہماری زبان ان کے ثقل کی متحمل نہیں ہو سکتی مثلاً Aristotle اس کا تلفظ انگریزی میں بھی یہی ہے اور اس میں جتنے حروف ہیں سب ضروری بھی ہیں۔ نہ کوئی زائد ہے نہ ساقط از آواز، مگر اردو میں آنے کی صلاحیت سے محروم ہے۔ قدیم عرب میں اسے 'ارسطاطالیس' کہا گیا اور اب صرف ارسطو رہ گیا۔ اسے اردو میں بھی بے تکلف برتا جا سکتا ہے۔ یہی حال Danial کا ہے۔ جو ذرا سے تصرف سے 'دانیال' بن گیا۔ اس سلسلے میں عربوں کی پیروی کی جا سکتی ہے اور جوزف، جونز اور جیکب کو بالترتیب یوسف، یونس اور یعقوب کہا جا سکتا ہے۔

اسمائے مقامات

عربی داں حضرات جانتے ہیں کہ Mar- Seilles کا صحیح تلفظ کیا ہے اور Brussels کو کیا کہیں گے۔ مگر ہمارے ہاں 'مارسلیز' اور 'برسلز' ہی چلتا ہے جبکہ درست تلفظ 'مارسیل' اور 'بروسیل' ہے۔ کیا یہ عجب نہیں کہ ہمارا بچہ 'روزیٹا' اور 'ڈیمیٹا' کے ناموں سے واقف ہے لیکن نہیں جانتے کہ یہ 'رشید' اور 'دمیات' کی بگڑی ہوئی شکلیں ہیں۔

www.kitaabistan.com

یہی معاملہ 'سوڈان' کا ہے۔ عربی میں اسود کے معنی سیاہ کے ہیں وہیں سے 'سوڈان' بنا تھا لیکن چوں کہ انگریز 'ڈ' تو بول سکتے ہیں 'د' نہیں کہہ سکتے، سو 'سوڈان' بن گیا۔ ہمیں چاہیے کہ اس نوع کے اسمائے مقامات کو لکھتے وقت ذرا سا غور و فکر کریں۔

الفاظ سازی اور انالہ ثقل کے لیے 'وضعِ اصطلاحات' از وحید الدین سلیم آج بھی قابل تقلید ہے۔

اول اول جس کسی نے بھی 'انگلینڈ' کے لیے 'انگلستان' تراشا تھا اس نے ایک سانچہ فراہم کر دیا تھا یعنی جن ملکوں کے اخیر میں 'لینڈ' ہے ان سب کا ترجمہ 'ستان' کیا جا سکتا تھا لیکن اس کی تقلید نہ کی گئی جو ضروری تھی۔ اس کی ایک اور صورت بھی ہے اور وہ یہ کہ اسکاٹ لینڈ کے لوگ 'اسکاچ' کہلاتے ہیں کیوں نہ اسکاٹ لینڈ کی بجائے 'اسکاچستان' کر دیا جائے تاکہ ایک اصول کی پیروی ہو۔ اس طرح پولینڈ 'پولستان' ہو جائے گا اور ہالینڈ 'ہالستان'

اسمائے نکرہ

اس سے متعلق لغت کی کتابیں اور الفاظ کی فرہنگیں ہماری مددگار ثابت ہو سکتی ہیں، جو باقی رہ جائیں ان کے لیے لفظ وضع کیے جا سکتے ہیں۔ البتہ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ مترجم وہی لفظ انتخاب کرے، جو سیاق کے لحاظ سے موزوں اور سباق کے اعتبار سے مناسب ہو۔ مثال کے طور پر انگریزی میں Line ہے۔ ڈاکٹر فیلن کی ڈکشنری میں اس کے معنی حسب ذیل ہیں۔

(۱) رسی، ڈور، دھاگہ (۲) لکیر، خط، دھاری، ریکھا، جدول، کشش (۳) ریاضی، خط، لکیر ریکھا۔ (۴) حد، مینڈ (۵) جھری، شکن، خط و خال، ملکھ، ریکھا۔

لغت میں تو مترادفات موجود ہیں لیکن اس امر کا انحصار مترجم کے علم و فضل پر ہے کہ وہ صحیح لفظ کا انتخاب کرے۔

جہاں تک ایسے اسمائے نکرہ کا تعلق ہے جو اردو میں رچ بس گئے مثلاً کالر، اسکول کالج، سگرٹ، سگار، ٹائی، بوٹ وغیرہ، تو ان کے متعلق قطعاً کسی کدو کاوش کی ضرورت نہیں۔

انھیں اسی طرح بولا اور لکھا جانا چاہیے۔ ہوائی جہاز کی جگہ عربی زبان کا لفظ 'طیارہ' بہت مناسب سہی لیکن اردو میں رائج نہیں سو 'ہوائی جہاز' سہی۔ البتہ اس بات کا خیال رہے کہ اس معاملے میں انگریزی تلفظ کی تقلید جائز نہیں۔ ان الفاظ کو اسی صورت میں برتا جانا چاہیے جس صورت میں وہ اردو میں آئے۔

اب ایسے اسمائے نکرہ کی طرف آئیے، جن کا اب تک اردو میں ترجمہ ممکن نہ ہو سکا ایسے الفاظ کا مفہوم معلوم ہو جانے پر لفظ تراشی اور اصطلاح سازی کا کام آسان ہو سکتا ہے۔ اس کی بہترین مثالیں 'تحلیلِ نفسی' (از ڈاکٹر محمد اجمل) اور مغرب کے تنقیدی اصول' (از سجاد باقر رضوی) ہیں۔ ان کتابوں میں انگریزی الفاظ اور اصطلاحات کے صحیح مفہوم تک پہنچ کر لفظ سازی اور اصطلاح سازی کی گئی ہے۔

اسمائے نکرہ کے باب میں یہ بات قابل غور ہے کہ بعض اوقات اسمائے معرفہ اسمائے نکرہ کے طور پر بھی برتے جاتے ہیں اور ان سے وہی معنی مراد لیے جاتے ہیں جو اسمائے نکرہ کی ذات میں پوشیدہ ہوتے ہیں۔ اس صورت میں وہ اسمائے معرفہ نہیں بلکہ اسمائے صفات ہوتے ہیں۔ مثلاً سنیل گواسکر ہندوستان کا 'ڈان بریڈ مین' ہے۔ یہاں ڈان بریڈ مین سے اعلیٰ درجے کا بلے باز مراد ہے۔

اس کی دو صورتیں ہیں۔ پہلی تو یہ ہے کہ مشبہ بہ اس قدر معروف ہو کہ اردو داں حضرات اس سے واقف ہوں۔ ایسے اسمائے معرفہ کو لینے اور مشبہ بہ کے طور پر برتنے میں کچھ مضائقہ نہیں اردو کا قاری سمجھ جائے گا اور اس نوع کے اسمائے نکرہ کا وہی اثر قاری کے ذہن پر مرتب ہوگا جو مصنف چاہتا ہے۔ صورت ثانی یہ ہے کہ مشبہ بہ اردو داں طبقے کے لیے نامانوس ہو۔ اس صورت میں شرح کی ضرورت پیش آئے گی۔ اور حاشیہ بنانا پڑے گا۔ مثلاً اگر متن میں یہ ہو کہ 'راجندر سنگھ بیدی ہندوستان کے آئزک باشویز سنگر ہیں' تو یہاں یہودی النسل نوبل انعام یافتہ ادیب سنگر کے لیے حاشیہ ضروری ہوگا۔ اس لیے کہ ہمارے ہاں عومی سطح پر سنگر کو بہت کم لوگ جانتے ہیں۔

اسمائے مادہ

جو اصول اسمائے نکرہ کے متعلق وضع کیے گئے ہیں ان کا اطلاق یہاں بھی ممکن ہے چونکہ اسمائے مادہ کا استعمال زیادہ تر علوم طبعی، تجارت اور صنعت و حرفت میں ہوتا ہے۔ اس لیے لازم ہے کہ مترجمین صنعتی اداروں میں عوامی سطح پر برتے جانے والے الفاظ و اصطلاحات پر نگاہ رکھیں اور دیکھیں کہ سیدھی سادی اور بے تکلف زبان میں یہ الفاظ کیوں کر برتے جاتے ہیں۔ یوں مترجم کو اپنے طور پر بہت کم تصرف کرنا پڑے گا۔ اس باب میں ہماری زبان مترجمین کی شرمندۂ احسان نہیں ہے بلکہ 'فلےٹل' کو فلالین اور 'لین ٹرن' کو 'لالٹین' بنانے والے عام ہندوستانی و پاکستانی مزدور ہیں۔ ہمارے ہاں کا معمولی اور ناخواندہ سپاہی Commanding Officer کو 'کمان افسر' اور Barrack کو 'بارک' کہتا ہے۔

جلیل قدوائی لکھتے ہیں:

جس زمانے میں سید راس مسعود مرحوم ناظم تعلیمات حیدرآباد دکن چند دن کے لیے دار الترجمہ کے کام کی براہ راست نگرانی کر رہے تھے۔ انھوں نے لفظ Water Shed کے لیے علماء اور تجربہ کار مترجمین کی طرف سے ترجمہ کیے ہوئے لفظ 'فصیل آب' کو ناپسند کیا اس لیے کہ وہ ثقیل تھا مگر انھیں یقین تھا کہ کوئی آسان مستعمل لفظ اس مفہوم کے لیے مل جائے گا اور یہی ہوا ایک بار وہ اپنے دورے پر ایک ایسے علاقے سے گزرے جہاں لوگوں نے Water Shed کے لیے 'پنڈھال' کا لفظ بنا دیا۔ وہ چونک پڑے اور خوشی خوشی اس لفظ کو قبول کر لیا۔ کتنا اچھا اور پیارا مرکب لفظ تھا۔ Water کے لیے پانی کا 'پن' اور شیڈ کے لیے 'ڈھال'۔ یہ واقعہ اس زبانی شہادت میں موجود ہے۔ جو انھوں نے دیسی زبانوں کو ذریعہ تعلیم کے طور پر استعمال کرنے خصوصاً اردو کو عثمانیہ یونیورسٹی میں ذریعہ تعلیم بنانے کی حمایت میں فادر بلیٹر کمیشن کے سامنے اکتوبر ۱۹۲۴ء میں بمبئی میں دی تھی۔[1]

---

[1] بحوالہ 'مسائل و مباحث'، مطبوعہ: اخبار اردو، کراچی دسمبر ۱۹۸۲ء ص ۲۵

ہمارے لغت نویس اور فرہنگ نگار حضرات کا فرض بنتا ہے کہ وہ صناعوں، تاجروں، پیشہ وروں اور مزدوروں تک رسائی حاصل کریں اور ان کے پیشوں اور صنعتوں کی جزئیات دریافت کریں۔ کوئی وجہ نہیں کہ ہم بھی H.W. Fowler کی Dictionary of modern English usage کی طرز کی لغت نہ تیار کر پائیں۔

اسمائے مجموعہ

اس باب میں اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں کسی قسم کا اختلاف نہیں پایا جاتا۔ یہاں انگریزی کی عامیانہ تقلید بھی نبھ جاتی ہے۔ اسمائے مجموعہ Collective Nouns کی ایک شق Noun of Multitude ایسی ہے جس میں ہمارے مترجمین سے اکثر لغزش ہو جاتی ہے۔ مثلاً انگریزی میں لفظ 'کمیٹی' جمع بھی ہے اور مفرد بھی۔ جب مفرد ہے تو Collective اسم، اسم مجموعہ کہلاتا ہے اور جب جمع ہے تو Noun of Multitude نام پاتا ہے۔ مگر اردو میں یہ لفظ ہمیشہ مفرد بولا جاتا ہے، کبھی جمع کے طور پر نہیں برتا جاتا۔ یہی باعث ہے کہ ہماری گرامر میں کوئی اصطلاح ایسی نہیں جو Noun of Multitude کا مفہوم ادا کر پائے اور شاید یہی وجہ ہے کہ ہم نے اس کا ترجمہ کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ مثال:

کمیٹی کا اجلاس ہو رہا ہے The Committee is setting

یہاں لفظ کمیٹی مفرد ہے۔ اور جب جمع ہوتا ہے تو یوں کہتے ہیں:

The Committee is dividend in their opinion

یعنی ارکان کمیٹی کی رائے میں اختلاف تھا۔ کمیٹی کے ممبر مختلف الرائے تھے۔ مگر یہ کبھی نہیں کہہ سکتے کہ کمیٹی اپنی رائے میں مختلف تھے۔ اس صورت میں ہم مجبور ہیں کہ ترجمے میں تصرف سے کام لیں اور لفظ 'ارکان' اپنی طرف سے بڑھائیں۔

واحد و جمع

اردو میں دو قسم کی جمعیں مستعمل ہیں (۱) فاعلی اور (۲) غیر فاعلی یا جمع مغیری۔

۱۔ جمع فاعلی وہ ہے جس کے بعد حروفِ مغیرہ میں سے کوئی حروف نہیں ہوتا۔

۲۔ جمع غیر فاعلی یا جمع مغیری وہ ہے، جس کے اخیر میں حروفِ مغیرہ میں سے کوئی حرف ہوتا ہے۔ مثلاً مندرجہ ذیل حروفِ مغیرہ ہیں:

میں، سے، پر، تک، کا، کے، کو، پہ وغیرہ۔

جمع فاعلی کیسے بنایا جائے

۱۔ جمع فاعلی بنانے سے پہلے یہ دیکھنا لازم ہے کہ وہ لفظ مذکر ہے یا مونث۔

۲۔ اگر وہ لفظ مذکر ہے تو یہ دیکھنا فرض ہے کہ اس کے آخر میں الف ہے کہ نہیں۔

۳۔ اگر الف ہے تو ساقط ہو جائے گا اور اس کی جگہ پائے مجہول (ے) کا اضافہ کر دیا جائے گا مثلاً بیٹا سے بیٹے اور لڑکا سے لڑکے ہو جائے گا۔

۴۔ اگر آخر میں الف نہیں ہے بلکہ کوئی اور حرف ہے تو وہ لفظ اپنی اصل صورت پر قائم رہے گا اس میں کسی طرح کا تصرف جائز نہیں مثلاً مکان، پتھر، درخت، گھر، صندوق، آلو وغیرہ۔

اس قبیل کے الفاظ واحد اور جمع میں یکساں رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں کم و بیش ابہام رہتا ہے۔ لیکن یاد رہے کہ یہ ابہام صرف الفاظ تک محدود رہے گا۔ فقرات میں باقی نہیں رہتا۔ فقرہ اس کی حیثیت (واحد یا جمع) کو واضح کر دیتا ہے۔ اس ابہام کا ازالہ کبھی اعداد وضمائر کے ذریعے ہوتا ہے اور کبھی افعال وصفات کے ذریعے مثلاً

آپ کا مکان، واحد، اور آپ کے مکان، جمع یا ایک مکان واحد، اور دو مکان جمع۔

ہمارے بیشتر مترجمین اس باب میں عربی اور فارسی کی کورانہ تقلید کرتے ہیں جو جائز نہیں

اب آیئے مونث لفظ کی طرف۔ اگر اس کی جمع بنانی مقصود ہو تو:

۱۔ یہ دیکھنا لازم ہے کہ اس کے آخر میں یائے معروف (ی) ہے کہ نہیں۔ اگر 'ی' ہے تو جمع 'اں' سے بنے گی مثلاً بیٹی سے بیٹیاں اور لڑکی سے لڑکیاں۔

یہاں بھی قدرے احتیاط کی ضرورت ہے بعض معروف مترجمین نے کرسی سے کرسیں لکھا ہے۔

اس باب میں ان الفاظ پر خصوصی توجہ کی ضرورت ہے دیکھنے میں مونث اور حقیقت میں مذکر ہیں۔ یعنی ان کے آخر میں یائے معروف (ی) موجود ہے مگر وہ ہیں مذکر۔ مثلاً۔ پانی، گھی، ہاتھی اور موتی وغیرہ۔ لازم ہے کہ ان الفاظ کو جمع بنانے کی صورت میں انھیں ان کی پہلی حالت میں رکھا جائے۔

۲۔ اگر آخر میں 'ی' نہیں ہے تو 'یں' کا اضافہ کیا جائے گا۔ مثلاً عورت سے عورتیں۔

جمع غیر فاعلی یا جمع مغیری کیسے بنایا جائے

اس کی واحد علامت (وں) ہوتی ہے مثلاً گھر کی جمع گھروں، میز کی میزوں اور دکان کی دکانوں۔ البتہ اس بات کا خیال رکھا جائے کہ جب واحد مذکر کے آخر میں 'الف' ہو تو وہ گر جائے گا مثلاً بیٹا سے بیٹوں اور لڑکا سے لڑکوں۔

خیال رہے کہ انگریزی کے اکثر الفاظ جمع میں برتے جاتے ہیں لیکن اردو میں ان کے مرادف الفاظ واحد کے طور پر مستعمل ہیں۔ اس صورت میں بھی مترجمین پر اردو کی پابندی لازم ہے مثلاً Trousers کی جگہ پاجامہ (واحد) آئے گا۔ اور Scissors (جمع) کی جگہ قینچی (واحد) آئے گا۔

بعض اوقات انگریزی الفاظ واحد اور جمع مختلف معنوں میں برتے جاتے ہیں۔ یعنی کسی لفظ کے واحد میں جو معنی ہوتے ہیں وہ جمع میں باقی نہیں رہتے بلکہ اس سے یکسر مختلف ہو جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں مترجم کو سیاق و سباق سے بصیرت حاصل کرنی چاہیے۔ مثلاً Good کے معنی ہیں عمدہ اور اچھا وغیرہ مگر Goods میں کہیں بھی عمدگی کا شائبہ تک نہیں اس کے معنی ہیں مال و اسباب۔ اسی طرح Arm بازو ہے اور Arms اسلحہ، Force قوت ہے اور Forces افواج۔

اس باب میں زیادہ احتیاط کی ضرورت وہاں پیش آتی ہے جہاں واحد کے صرف ایک معنی ہوتے ہیں اور جمع کے ایک سے زائد مثلاً

معنی بعید معنی قریب جمع معنی واحد

www.ktaabistan.com

محصول درآمد رسوم ورواج Customs رسم ورواج Custom

اثاثہ اثرات Effects اثر Effect

عمارت قضایا Premises قضیہ Premise

انگریزی کے بعض الفاظ ایسے بھی ہیں جن کے معنی واحد اور جمع ہر دو حالتوں میں ایک سے زیادہ ہوتے ہیں مثلاً

(۱) باغ (۲) سبب (۳) تپھٹ Grounds (۱) زمین (۲) سبب Ground

(۱) حروف (۲) ادب (۳) خطوط Letters (۱) حرف (۲) خط Letter

انگریزی میں بعض الفاظ ایسے بھی ہیں جن کے واحد میں ایک سے زائد معنی ہوتے ہیں اور جمع کی صورت میں صرف ایک معنی رہ جاتا ہے۔ مثلاً Foot کے معنی ہیں (۱) پاؤں (۲) پیدل فوج جب کہ جمع Feet کی صورت میں صرف 'پاؤں' رہ گیا۔ دیگر مثالیں دیکھیے:

جمع واحد

(۱) گھوڑے Horses رسالہ (۲) گھوڑا Horse

(۱) اقوام Peoples لوگ (۲) قوم People

(۱) سفوف Powders سفوف (۲) بارود Powder

تذکیر وتانیث

اردو زبان میں لفظی سطح پر صرف دو جنسیں ہیں (۱) مذکر (۲) مونث ہمارے ہاں کوئی جنس نہیں جسے 'مخنث' کہا جائے اور جسے مردہ یا بے جان چیزوں کے اظہار میں برتا جا سکے۔ جب کہ انگریزی میں ایسا ہے۔ سو اردو میں اس کے نہ ہونے سے ہمارے مترجمین کو اس قدر دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ توبہ ہی بھلی۔

پھر اس باب میں خود اردو زبان کی سطح پر اس قدر اختلاف ہیں کہ اتحاد واتفاق کسی طور ممکن ہی نہیں۔ ایک لفظ دلی میں مذکر اور لکھنؤ میں مونث بولا جاتا ہے اور دوسرا ہے کہ لکھنؤ میں

مذکر ہے اور دلی میں مونث۔ دلی اور لکھنؤ دونوں زبان کے مراکز ہیں۔ دور افتادہ لوگ حیران ہیں کہ کس کی تقلید کریں اور کس کی نہ کریں۔

ان حالات میں مترجم کی کوشش یہی ہونی چاہیے کہ زبان کے مراکز کی حتی الامکان تقلید کریں اور انگریزی کی تقلید میں مزید غلطیوں کا اضافہ نہ کریں۔

بسا اوقات انگریزی زبان میں بے جان چیزوں سے اس طرح خطاب کیا جاتا ہے گویا وہ زندہ ہوں اور اس حالت میں انگلستان کے فصحا نے یہاں تک کیا ہے کہ انھیں 'مخنث' نہیں رہنے دیا بلکہ حسبِ موقع مذکر یا مونث بنا دیا ہے۔ ولیم شیکسپیئر نے موت اور خواب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ہے: 'اے موت'! 'اے خواب'! وغیرہ اگر یہ اندازِ بیان اردو کے اصولوں کے خلاف ہو تو انگریزی کی نہیں اردو کی تقلید فرض ہے۔ مثلاً انگریزی میں 'موت' مذکر ہے اور اس کے افعال وصفات سب مذکر ہیں مگر اردو میں موت مونث ہے اور اس کے متعلقات بھی مونث رہیں گے۔

اندازِ بیان کا فرق

انگریزی زبان کے اندازِ بیان کو دیکھیں تو اس کی دو صورتیں ہیں:

(۱) Direct اور (۲) Indirect

جب کہ اردو میں صرف ایک اندازِ بیان Direct ہی مروّج ہے۔ اس ضمن میں اجتہاد کی ضرورت محسوس کی گئی ہے لیکن یہ ہر کس وناکس کا کام نہیں۔ 'ستاداں کے ناول 'سرخ وسیاہ' اور گستاؤ فلابیئر کے ناول 'مادام بواری' کو ترجمہ کرتے وقت محمد حسن عسکری صاحب نے اپنے نئے اسلوبی سانچے وضع کرنے کی کوشش کی ہے۔ جو قابلِ ستائش ہے لیکن اس نوع کا کام بہت کم ہوا ہے۔

اس لیے پہلے مرحلے پر ہمیں یہی کوشش کرنی چاہیے کہ Direct اندازِ بیان کو ہی اپنائیں اور Indirect طریقۂ کار میں غلط ترجمہ کرنے سے بچیں۔ اس کی صورت یوں ہو گی:

www.kitaabistan.com

Direct Akbar

said "I am ill" Hamid said to me "Jamil." He said to him, "Where are you going" Indirect Akbar said that he was ill Hamid told me that I was ill. He enquired of him whether he was going

اردو ترجمہ

اکبر نے کہا میں بیمار ہوں

حامد نے مجھ سے کہا کہ میں بیمار ہوں۔

اس نے اس سے پوچھا کہ کہاں جارہے ہو۔

ترجمے کی بندشیں

مندرجہ بالا اصولوں کی پابندی کے باوجود یہ ضروری نہیں کہ ہم لازماً بہترین ترجمہ کرپائیں۔ ہمیں بعض جگہوں پر چند دیگر سوالوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ مثال کے طور پر۔

(۱) جہاں اصل عبارت کا مفہوم صاف نہ ہو۔ اصل متن کی عبارت الجھی ہوئی ہو اور ایک کی بجائے کئی معنی دے رہی ہو تو مترجم کا کیا فرض بنتا ہے؟

(۲) کیا وہ بھی اس نوع کی کوشش کرے کہ ترجمہ کئی معنی دے؟

(۳) کیا مترجم کو حق حاصل ہے کہ اپنی طرف سے چند اضافوں کے ساتھ مطلب کو صاف کردے؟

ایسی صورتوں میں مختلف مترجمین نے ایک سے زاید طریقہ ہائے کار برتے ہیں اور ان میں سے کوئی ایک صورت مسئلے کا آخری حل نہیں۔

اس باب میں ظ۔ انصاری رقمطراز ہیں:

"ایسی صورتوں کا حل بڑی حد تک اس موضوع پر، موضوع کے اس حصے پر اور

اصل مصنف کے بیان پر منحصر ہے۔

(۱) ممکن ہے عبارت کا اصل مفہوم اس لیے صاف نہ ہو کہ مصنف کی بیانیہ کمزوری سے وہ الجھا رہ گیا ہو۔ اگر مصنف کو قدرت ہوتی یا اسے معلوم ہوتا کہ فلاں جگہ اس کی عبارت گنجلک ہے تو وہ اسے زیادہ وضاحت اور سلاست کے ساتھ بیان کرتا۔ اگر یہ صورت نظر آئے تو ترجمہ کرنے والے کی قابلیت اس میں ہے کہ ترجمے میں اپنی طرف سے کچھ الفاظ کا یا اندازِ بیان کا اضافہ کرکے انھیں ایسے لکھے کہ عبارت سلجھ جائے۔

(۲) ممکن ہے اس مقام پر عبارت کو گنجلک رکھنے کا کوئی خاص مقصد ہو۔ بعض موقعوں پر یہ بات ضروری ہوتی ہے۔ خاص طور پر شاعری میں ایسے مقامات آتے ہیں جہاں پر نکتے کو سلجھانا ضروری نہیں ہوتا۔ آرٹ میں بعض جگہ تاریک گوشے اصل مقصد کو نمایاں کرنے کا ذریعہ ہوتے ہیں یا بعض جگہ ہلکے سے پردے کسی مجبوری کی وجہ سے ڈال دیے جاتے ہیں۔ صاف بات اگر کہی جائے تو اسے پڑھنے والوں کی سوجھ بوجھ برداشت نہیں کرے گی۔ یا حکومت برداشت نہیں کرے گی یا مذہبی اور اخلاقی ادارے چراغ پا ہو جائیں گے یا بیان کے حسن میں فرق آجائے گا اور لذت کم ہو جائے گی ان وجہوں سے بھی یہ ہوسکتا ہے کہ اصل مصنف نے اپنی عبارت کو کسی قدر ڈھکا چھپا رہنے دیا ہو۔ ایسے مقامات کا اور مصنف کے اس مقصد کا اندازہ لگا لینا ترجمہ کرنے والے کے دل و دماغ اور اچھی صلاحیت پر منحصر ہے۔ اگر وہ اسے پالیتا ہے کہ یہاں عبارت کو اور زیادہ واضح کرنے اور عام فہم بنا دینے سے اصل عبارت کی وہ ادا اے حجاب جاتی رہے گی جو مصنف کا منشا ہے تو اسے مصنف کے منشا کی پابندی کرنی چاہیے اور عبارت کو جوں کا توں اپنی زبان میں منتقل کرنا چاہیے۔

(۳) اب اگر کہیں مترجم دیکھتا ہے کہ اصل عبارت میں فلاں حصہ ایسا ہے کہ اس کے کئی معانی نکل سکتے ہیں تو اسے سوچنا ہوگا کہ مصنف خود اس مقام پر

کئی معانی پیدا کرنا چاہتا تھا، وہ ایک رنگ میں کئی ہلکے ہلکے رنگوں کی آمیزش رکھنا چاہتا تھا یا اس کے ذہن میں اپنا ایک مفہوم تھا اور وہ لفظ یا جملہ ایسا لکھ گیا جس سے بیک وقت کئی شعاعیں پھوٹتی ہیں اور بیان کی یک رنگی یا وضاحت میں حائل ہوتی ہیں۔ یہاں پھر مصنف کے منشار کی پابندی کرنی ہوگی۔

اگر پہلی صورت ہے تو اسے اپنی زبان میں ترجمے کے لیے ویسا ہی لفظ یا ویسا ہی محاورہ ڈھونڈنا ہوگا۔ جو کئی کئی معانی کی طرف اشارہ کرتا ہو اور اگر دوسری صورت ہے تو اسے اصل عبارت کی حدود سے آگے بڑھ کر ایسا لفظ تراشنا ہوگا جو چاہے لفظی ترجمہ ہو یا نہ ہو، لیکن اس ایک مفہوم کے لیے سب سے زیادہ جامع اور مانع وہی ہو اسے اپنے ترجمے میں اصل کی عبارت یا جملے سے باقی تمام مفہوموں کو راستے سے ہٹانا ہوگا اور صرف ایک کو آگے بڑھانا ہوگا۔[1]

آخری بات یہ ہے کہ یہ تمام تر مترجم کے سلیقے پر موقوف ہے کہ وہ اصل متن کو کس طرح اپنائے بعض اوقات صورت معنی سے دست و گریبان ہوتی ہے اور معنی روح، ذوق یا لب و لہجہ سے الجھ پڑتے ہیں۔ ایسے میں مترجم کو تخلیقی سطح کی سوجھ بوجھ سے کام لینا پڑتا ہے، مجبوراً ذاتی عناصر کو شامل کرنا پڑتا ہے۔

ایسی صورت میں ممکن ہے کہ مترجم کی اپنی طرز ادا اور اسلوب تحریر نمایاں ہونے لگے۔ اس میں احتیاط لازم ہے۔ لیکن جہاں تک اس نے سر تسلیم خم کیا ہے اور مندرجہ بالا مجبوریوں کی بنا پر اس کی اپنی اہمیت یا شخصیت ترجمے میں جاگی ہے تو یہ اس کا حق ہے۔ اس لیے کہ وہ محض نقال نہیں بلکہ مصنف کا ہمنوا، ہم مشرب اور حریف بھی ہے۔

---

[1] بحوالہ: ترجمے کے بنیادی اصول، مطبوعہ: ادب لطیف، لاہور اگست ۱۹۵۳ء

انیس ناگی

ترجمے کی ضرورت

آج کل ضرورتوں کا سیلاب امڈ آیا ہے، جدھر اور جہاں نگاہ جاتی ہے ضرورتوں کا بھوت منہ پھاڑتا ہے، جب چاروں طرف دل بہلانے اور ترسانے والی ضرورتوں کا حصار ہو، کونسی ضرورت غلبہ پاتی ہے، اس کا دارومدار مغلوب ہونے والے پر ہے کہ وہ کس ضرورت کو اولیت کا درجہ دیتا ہے ضرورت موجود میں غیر موجود کی تلاش یا موجود کے حصول کی خواہش سے پیدا ہوتی ہے ضرورت اور ضرورت مند کے مابین بُعد کا قیام لازمی ہے، ورنہ حصول یا تکمیل، ضرورت کے وجود کو ختم کر دیتے ہیں۔ ضرورتوں میں حفظ مراتب، تقدیم و تاخیر کا مدار، نقطۂ نظر زندگی کے مختلف مظاہر سے متعلق رویوں کی اجتماعی ہیئت سے عنوان پاتا ہے۔ چناں چہ زندگی میں ایک ضرورت کا انتخاب دیگر شعبہ ہائے زندگی کی ضرورتوں کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔ اطمینان بخش ضرورت کی سرگوشی ہے۔

آج کل ضرورتوں کا سیلاب امڈ آیا ہے، چھوٹی چھوٹی انفرادی ضرورتوں کے غلبے نے اجتماعی ضرورتوں کے تصور کو محو کر دیا ہے، نتیجہ خود مرکزیت، یہ معروضیت کا انہدام ہے، موضوع سے معروض کا سفر کسی صورت حال یا شے کو اپنے آپ سے علاحدہ کر کے دیکھنے کا عمل ہے، جس میں ذات ایک حوالہ بن کر اپنے سے باہر ایک وسیع تر وجود میں شرکت پر آمادہ کرتی ہے۔ ایسی مصروفیت کی عدم موجودگی نے جہاں ہمارے معاشرے میں بہت سے مسائل پیدا کر دیے ہیں، وہاں ہماری فکری زندگی بھی عجیب کسمپرسی کی حالت میں ہے۔

---

[1] مشمولہ "تصورات" شائع کردہ پبلی کیشنز، لاہور۔

www.kitaabistan.com

ہمارے معاشرے میں سوچ کے دھارے روز بروز خشک ہوتے جا رہے ہیں۔ دوسرے محرکات کے علاوہ، اہم اور غیر اہم ضروریات کی افراط تفریط میں انتخاب کی عدم صحت نے اس صورتِ حال کو زیادہ تشویشناک بنا دیا ہے۔ سوچ کے سوتے اگر ایک طرف معاشرتی عمل اور تعمل سے جنم لیتے ہیں تو دوسری طرف علم و ادب کے میدان میں بھرپور تخلیقی عمل سے وجود اختیار کرتے ہیں۔ لیکن تخلیقی میدان میں بھی یہی مشکل درپیش ہے کہ یہاں بھی دوسرے شعبہ ہائے زندگی کی طرح ابتری اور خود مرکزیت ہے۔ اول تو ادیب حقیقی تخلیق سے گریز کر رہا ہے اور اگر تخلیق کرتا بھی ہے تو اس کا روئے سخن اپنے زمانے سے نہیں ہے۔ اس وقت جب کہ اجتماعی طور پر ہم کسی دستور العمل یا نظریے کی تائید پر آمادہ نہیں ہیں، اس وقت جب کہ ہم نے غیر اہم ضروریات کو اس قدر اہم بنا دیا ہے کہ ہمیں چھوٹی چھوٹی منفعتوں کے بجز اور کچھ نظر نہیں آتا۔ لفظ کا بے اثر اور بے حرمت ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ اس بے حس صورتِ حال کے حصار کو ہر قسم کی رکاوٹوں اور دل شکن بندشوں کے باوجود، خواہ وہ ناشروں کی طرف سے ہوں یا کسی اور ادارے کی جانب سے، یہ ہم تخلیقی عمل کے ذریعے توڑا جا سکتا ہے، ایک خاص قسم کی ذہنی اور جذباتی فضا کے ذریعے نظریات کو فروغ دیا جا سکتا ہے۔ خصوصاً ایسے نظریات کو جو اجتماعی قلب ماہیئت کا یارا رکھتے ہوں، جو زندگی کی نئی عقلی اور جذباتی بنیادوں پر استوار کرنے کی صلاحیت کے حامل ہوں، لیکن یہ تب ممکن ہو گا اگر ہم اپنے معروضی وجود سے غافل رہنا پسند نہ کریں۔

اس صورتِ حال میں جب تخلیقی عمل سست روی کا شکار ہو اور نئے نظریات اور جذباتی پیراؤں کی تشکیل و تدوین کی اہلیت کسی قدر سلب ہو چکی ہو تو اس وقت خیالات کی ترویج اور نظریات کی تشکیل غیر ملکی ادب، فکر اور دیگر شعبہ ہائے تخلیقات کے ذریعہ متواتر تراجم کی ضرورت نہ صرف ایک اجتماعی تقاضے کی سطح پر ابھرتی ہے۔ بلکہ ادبی اور علمی سطح پر بھی ناگزیر ہو جاتی ہے کیونکہ تصوراتی اور فکریاتی سطح پر اس جمود کو ختم کرنے کا ایک ذریعہ تصوراتی اور جذباتی رویوں کا ایک زبان سے دوسری زبان میں انتقال ہے۔ غیر ملکی ادب، فنون اور سائنسی علوم کے تراجم کے سلسلے میں سب سے اہم ضرورت اپنی ضروریات کا احساس ہے کہ ہم کسی قسم کے نظریات،

ادبی لہجے اور فکری پیرائے کی ترویج یا احیا چاہتے ہیں؟ کیا ہمیں واقعی ایسے تراجم کی ترویج سے گریز کرنا چاہیے جن کی غیر ملکی طاقتیں مخصوص عزائم کے پیشِ نظر سرپرستی کا وعدہ کرتی ہیں؟ کھری بات تو یہ ہے کہ ذہنوں کی تبدیلی، فکر کی نشوونما اور تہذیبی سانچوں کی پرورش کے لیے ایسے تصورات کے فروغ کی ضرورت ہے جو علمی و ادبی سطح پر نہ صرف ایک وسیع تناظر مہیا کر کے اشیاء، موجود اور وقائع کی تصریح میں تغیر یا اضافے کی ضامن ہوں بلکہ ایک مخصوص زمانی سیاق و سباق میں پیدا شدہ تضادات اور مسائل کے تجزیہ، تردید یا ارتجاب کا قرینہ بھی مرتب کریں۔ ثقافتی سطح پر ترجمہ دو مختلف تہذیبوں کے مخصوص رویوں کے روبرو ہونے کا عمل ہے، بلکہ یہ ایک تہذیبی مزاج کا اور دوسری تہذیبی شخصیت کا تعارف ہے۔ یورپی اور مغربی زبانوں کے برعکس بیشتر مشرقی زبانیں اور خصوصاً اردو زبانوں کے حوالے سے تنہائی کا شکار ہیں اور اس تنہائی نے اس شخصیت کے خطوط کو اتنا بھدا کر دیا ہے کہ وہ ارتباط سے عموماً گریز کرتی ہے، اسے اپنے علاوہ ہر دوسرا اوپرا نظر آتا ہے، غالباً یہی وجہ ہے کہ ابھی تک اردو زبان میں ہر طرح کے موضوعات و مضامین کی ادائیگی کی صلاحیت بہت کم ہے۔ جب بھی فلسفہ، نفسیات یا سائنسی علوم پر کچھ لکھنے کی نوبت آتی ہے تو ذہن قدیم فارسی عربی، یا بعض اوقات ہندی اصطلاحات کا تعاقب کرتا ہے، نتیجہ اس کا ظاہر ہے، اپنی مکمل شکل میں تحریر ایسے ادق الفاظ کا مجموعہ بن جاتی ہے کہ مافی الضمیر اوجھل ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں کچھ تو مناسب الفاظ کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ اور کچھ اردو کا ڈھیلا لسانی سیاق و سباق ہے۔ جسے تصورات کی تشکیل کے لیے استعمال نہیں کیا گیا ہے، اس لیے اردو زبان بالغ اور بھرپور اظہار کی صلاحیت سے عاری رہی ہے۔ ابھی تک اردو زبان میں غیر ملکی ادب کا جو کچھ ترجمہ ہوا ہے وہ ہر ایک کے سامنے ہے۔ دنیا کی دوسری زبانوں میں قارئین دوستوفسکی، بودلیر، شیکسپیر، سفوکلیز، نطشے، ہیگل، کانٹ نہ جانے کون کون سے ادیبوں اور مفکرین کی تخلیقات سے بہرہ ور ہوتے ہیں لیکن ہمارے یہاں صرف انگریزی خواں طبقہ ان سے مستفید ہو سکتا ہے علم اور ہدایت کے یہ سرچشمے ایک خصوصی طبقاتی حق بن گئے ہیں، لیکن کیوں؟ اس لیے کہ ہمیں اپنی اہم ضرورتوں کا احساس نہیں ہے۔ ہمارا شاعر یا ادیب ایک لنگڑی سی غزل اور نیم جاں سا

افسانہ لکھ کر اپنی جان چھڑاتا ہے اور اپنی مکمل ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے سے گریز کرتا ہے یہ ذکر بے محل نہیں کہ ہمارے شاعروں یا ادیبوں نے اپنے تخلیقی عمل کو شعری یا نثری ہیئتوں کے چھوٹے چھوٹے خانوں میں بانٹ رکھا ہے، جب شعر و ادب ایسی نزائی موقعیت میں الجھا ہو کہ زبان بالیدگی فکر کی متحمل نہ ہو تو اس وقت تمام شاعروں اور ادیبوں کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ من حیث المجموع شعر و ادب اور زبان میں مختلف ذرائع سے توانائی پیدا کریں اس کے مزاج، رنگ و آہنگ اور ذرائع کے امکانات کا جائزہ لیں۔

اس کے برعکس ہمارا دانشور طبقہ ملکی تخلیقات کے تراجم کی بجائے سرقہ بالجبر سے کام لیتا رہا ہے۔ جب جی چاہا حسبِ ضرورت کسی مفکر یا مصنف کی تخلیق سے کچھ حصہ اخذ کیا، بعض دفعہ اس کا حوالہ درج کیا اور بعض دفعہ اس کا نام گول کر کے اپنا نام جڑ دیا، جس سے نہ تو ماخذ تصور کی صحت کا سراغ مل سکتا ہے اور نہ اس کے سیاق و سباق کا، کیوں کہ اردو خواں قاری کے لیے اصل متن دوسری زبان کے لبادے میں نظر سے اوجھل رہتا ہے۔ ترجمے کا یہ بالواسطہ اسلوب گو جزوی طور پر نظریات کے انتشار میں معاون تو ضرور ثابت ہوتا ہے، مگر ان کی صحت اور افادیت ایک حد تک مشکوک رہتی ہے۔ اگر ایک طرف نئے معاشرتی، سیاسی علمی و ادبی نظریات کی آفرینش کے لیے براہ راست تراجم کی ضرورت ہے تو دوسری طرف اردو زبان کی نئی تشکیل اور وسعت کے لیے اس میں نئے تصورات، نئے الفاظ اور نئے جذباتی پیرایوں کو منتقل کرنے کی ضرورت ہے۔ اہلِ ایران کو دیکھیے کہ انھوں نے اپنے کثیر علمی و ادبی ذخیرے کے باوجود فارسی جدید کی تعمیر و تشکیل کے لیے بیسویں صدی کا نصف سے زیادہ حصہ وقف کر دیا ہے۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اہلِ ایران نے تمام دنیا کے عظیم ادب کے تراجم کر کے فارسی جدید کو اظہار کے اس مرحلہ پر پہنچایا ہے، جہاں اس میں ہر طرح کے علمی سائنسی، معلوماتی الفاظ، تراکیب اور اصطلاحوں کے ذخیرے دستیاب ہیں، اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ انھوں نے سرکاری اور تعلیمی سطح پر فارسی کو ابلاغ و اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ یہ درست ہے کہ ایران جدید کا سیاسی ماضی ہمارے سیاسی ماضی سے مختلف ہے تاہم انھوں نے من حیث القوم تراجم کے اور ان کی معیاری اشاعت کے نہ ختم ہونے والے سلسلے کے ذریعے

جدید فارسی کی تعمیر کی ہے۔ اہلِ ایران نے جدید فارسی کی تعمیر میں فرانسیسی زبان سے بھی مدد لی ہے۔ جو ایران میں فارسی کے بعد ثانوی درجہ رکھتی ہے۔ اہلِ ایران کے برعکس ہمارے یہاں اردو زبان کی تشکیل کا کوئی واضح لائحہ عمل نہیں ہے کہ اردو زبان کی توسیع و تشکیل کے عمل میں کن زبانوں سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ مغربی زبانوں میں انگریزی زبان کا اثر و نفوذ اتنا واضح ہے کہ مزید شرح کا محتاج نہیں ہے البتہ اس کے بارے میں بھی لائحہ عمل مرتب کرنے کی ضرورت ہے کہ اس کے الفاظ و تراکیب کو کس حد تک اور کس طرح "اردو یا" جائے۔ اسی طرح فارسی زبان سے بھی ہمارا تعلق کچھ مبہم سا ہوتا جا رہا ہے۔ لسانی سطح پر ابھی تک ہمارا رابطہ کلاسیکی فارسی سے رہا ہے۔ اور ہم نے عمداً کلاسیکی فارسی کے لہجوں کو اپنایا ہے، اردو زبان نے جو کچھ فارسی سے حاصل کیا ہے وہ کلاسیکی ہے، اس کی اغلب وجہ یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد اہلِ ایران سے ہمارا رابطہ ختم ہو چکا تھا اور اردو زبان نے اپنے تشکیلی مراحل میں انگریزی کی طرف رجوع کیا تھا۔ مختلف زبانوں میں زبان کی رنگت سیاسی اور تجارتی اور دیگر محرکات کے زیرِ اثر بدلتی رہتی ہے۔ اب جب کہ قومی سطح پر انگریزی زبان کو واپس اس کے ملک بھیجنے کا مسئلہ زیرِ غور ہے، اس لمحے اس کا نعم البدل تلاش کرنے کی ضرورت بھی ہے کیوں کہ پسماندہ زبانوں کو اپنے توسیعی عمل میں ترقی یافتہ زبانوں سے تعلق رکھنا اگر ناگزیر نہیں تو ضروری ہے، اس لیے کوئی زبان تنہائی میں نشوونما نہیں پا سکتی۔ فی زمانہ علوم، ادبیات اور فنون تنوع اور لسانی قید و بند کے باوجود ایک زبان سے دوسری میں منتقل ہونے کا رجحان رکھتے ہیں، وہ نظریاتی اور جذباتی بُعد جو ٹیکنالوجی کی عدم موجودگی میں مختلف زبانوں اور ادبیات کو تنہا رہنے پر مجبور کرتا تھا، کم و بیش ختم ہو چکا ہے۔ جہاں بھی کسی زبان یا ملک میں کوئی غیر معمولی کارنامہ پذیر ہوتا ہے ہر ایک اس سے رابطہ استوار کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ عہدِ جدید میں زندگی گزارنے کے لیے اپنے اردگرد سے آگاہی لازمی ہے۔ ہر ایک زبان کو عہدِ جدید سے ربط استوار رکھنے کے لیے ایک دوسری زبان پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ ہمیں اردو زبان کی توسیع اور تعمیر کے لیے انگریزی کو ملک بدر کرنے کے باوجود علمی و ادبی سطح پر قائم رکھنا ہوگا۔ کیونکہ ہمارا

بیرونی دنیا سے رابطہ اسی زبان کے توسط سے ہے۔ اگر پہلے اس زبان کو ہمارے معاشرے میں مرکزیت تھی تو اب اس کی حیثیت خبر کے ایک ذریعہ کی ہونی چاہیے۔ دوسری طرف اردو زبان میں نئے لہجے پیدا کرنے کے لیے اسے نہ صرف مقامی زبانوں سے متصل کرنا ضروری ہے بلکہ فارسی جدید سے اس کا ربط استوار کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، فارسی اردو زبان کی نسبت زیادہ باصلاحیت اور مضبوط زبان ہے۔ جس نے اپنی قوت کے لیے غیر ملکی ادب کے ہزارہا تراجم اپنے اندر سمونے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ وہ محنت جو اہل ایران نے علوم و فنون اور ادبیات کی سطح پر کی ہے اردو زبان مزاج، رسم الخط، صرف و نحو اور ذخیرۂ الفاظ کے اشتراک کے باوصف اس سے بکمال آسانی مستفید ہو سکتی ہے، وہ گھٹن، وہ بے بسی اور کم مائیگی جو اردو زبان میں سنجیدہ اور غیر رسمی تحقیقات کے دوران پیش آتی ہے اس پر قابو پایا جا سکتا ہے۔

تراجم کا عمل انسانی تمدن، مزاج اور تاریخ کی دریافت اور شناخت کا ایک بھرپور ذریعہ ہے، انسان جو رنگوں، زبانوں اور جغرافیائی بندشوں اور سیاسی تفرقات کی بدولت انسان ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہے، ترجمے کے ذریعے ایک زبان کو اپنی زبان کے حروف تہجی میں ڈھالنے سے انسانی سطح پر ایک دوسرے سے تعارف حاصل کرتا ہے۔ ابھی تک ہمارا غیر ملکی دنیا سے تعلق صحافتی اور اخباری سطح پر رہا ہے۔ یعنی ہم یہ جانتے ہیں کہ فلاں ملک کس جگہ پر واقع ہے۔ وہاں کس کی حکومت ہے اور لوگ کون سی زبان بولتے ہیں۔ یہ تعلق معلوماتی اور علمی اعتبار سے افادی تو ضرور ہے لیکن وہاں کے جمہور کے مزاج، تمدن اور زندگی کے ذہنی اور جذباتی رنگ و آہنگ کی خبر نہیں دیتا۔ اپنے آپ کو جذباتی اور ذہنی سطح پر باخبر رکھنے کے لیے دوسروں کا دکھ درد جاننے اور شرکت کرنے کے لیے ترجمہ ہی ایک ایسا وسیلہ ہے، جو خبر کا ذریعہ بنتا ہے۔ جو انسانوں میں اشتراک کا قرینہ پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ زبان کی توسیع تمدن کے تعارف، انسانی کائنات کی دریافت اور تاریخ کے وقوف کے لیے ایک سے زیادہ زبانوں سے رابطہ پیدا کرنا ضروری ہے۔ ہمارے یہاں تہذیبی، معاشرتی اور ادبی سطح پر وہی معیار رہے ہیں۔ جو انگریزی زبان کے ذریعے

ہم تک پہنچے ہیں، جس طرح ۱۸۵۷ء کے بعد یہاں کے لوگوں کے لیے انگریز اور انگریزی زبان، مغربی تمدن اور علم کی واحد اور آخری صورت تھی، اسی طرح آج بھی ہمارے لیے لسانی مجبوریوں کی بدولت انگریزی زبان مغربی علم و فنون کی معرفت کا ذریعہ ہے۔ جو فکر اور جذباتی اسلوب ہمیں انگریزی زبان کے ذریعے ملتے ہیں، ہم اسی پر اکتفا کرنے پر مجبور ہیں۔ یہ درست ہے کہ انگریزی مغرب کی سب سے اہم زبان ہے لیکن کیا یہ تمام دنیا کے ادب اور علوم کو ہم تک پہنچا رہی ہے؟ فی زمانہ ہر کوئی تعصبات اور سیاسی مصلحتوں کی زنجیر میں ہے اور صرف اسی فکر یا چیز کی نمائندگی پر توجہ دیتا ہے۔ جو اس کے مقاصد سے مطابقت رکھتی ہے، اگر اس مفروضہ نما حقیقت کی صحت پر اعتماد کیا جائے تو پھر تراجم کے لیے ایک سے زیادہ زبانوں کے ادبیات اور دیگر علوم سے رابطہ قائم کرنے کی ضرورت ہے۔

ہم براہِ راست تراجم، بالواسطہ تراجم اور براہِ راست مطالعہ کے توسط سے اہلِ مغرب کے بارے میں کافی کچھ جانتے ہیں۔ لیکن ابھی تک ہماری نگاہ سے مشرقِ وسطیٰ، مشرقِ بعید اور ہند چینی کی دنیا کے بہت سے گوشے مخفی ہیں، ایک اعتبار سے ان علاقوں کے لوگوں کا سیاسی اور معاشی مقدر ہم سے چنداں مختلف نہیں ہے اور وہ جغرافیائی اور کسی حد تک نسلی اعتبار سے بھی ہم سے کچھ قریب ہیں، ہم ان کی دنیا سے بے خبر ہیں، ہم براعظم افریقہ اور جنوبی امریکہ کے بارے میں صرف اتنا ہی جانتے ہیں جتنا یو این او کی مطبوعات ہمیں بتاتی ہیں۔ ان علاقوں اور خطوں کے لوگ اپنے مقسوم کی تشکیل میں جس جدوجہد سے گزر رہے ہیں، ہم ان سے واقف نہیں ہیں، کیا یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم تراجم کے ذریعے ان کی زندگی میں شرکت کر سکیں اگر وہ مظلوم ہیں تو ان کی حمایت میں آواز اٹھا سکیں، اگر وہ ظالم ہیں تو ان کے خلاف جدوجہد کریں؟ لیکن ان تک پہنچنے کے لیے انھیں جاننا ضروری ہے چنانچہ اس وقت تراجم کے سلسلے میں خصوصاً ایسی اقوام کی ادبیات کو اہمیت دینی چاہیے جو تاریخ کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ یہ ترجمے کی ضرورت کا ایک اہم پہلو ہے۔ جو اتنا ہی اہم ہے جتنا متمدن ملکوں کی ترقی یافتہ زبانوں کے علم و ادب کے ترجمہ کا!

شہباز حسین

ترجمہ کی اہمیت

ترجمہ بڑا مشکل کام ہے۔ یہ نگینہ جڑنے کا فن ہے جو بڑی مہارت اور ریاضت چاہتا ہے۔ ایک زبان کے معانی اور مطالب کو دوسری زبان میں اس طرح منتقل کرنے کے لیے کہ اصل عبارت کی خوبی اور مطلب جوں کا توں باقی رہے۔ دونوں زبانوں پر یکساں قدرت کی ضرورت ہوتی ہے جو عام طور پر کمیاب ہوتی ہے۔ ترجمے بہت ملتے ہیں اچھے ترجمے خال خال ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو دو زبانیں جانتا ہے بزعم خود مترجم بن بیٹھتا ہے اور ایسے ایسے گل بوٹے کھلاتا ہے کہ ترجمے کی اہمیت اور افادیت مجروح ہو جاتی ہے اور ترجموں پر سے اعتبار اٹھ جاتا ہے۔

ذرائع آمد و رفت میں وسعت اور سرعت آجانے کی وجہ سے دنیا کی مختلف زبانیں بولنے والوں میں ارتباط اور اختلاط روز بروز بڑھتا جا رہا ہے اور ایک دوسرے کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے ضرورتاً ایک دوسرے کی زبان سیکھنی پڑتی ہے اور ملوکیت میں وہ افراد یا طبقے ہمیشہ ممتاز رہے جنھوں نے حاکموں کی زبان سیکھنے میں سبقت کی۔ حاکموں نے بھی محسوس کیا کہ امن و استحکام کے لیے صرف زورِ بازو ہی کافی نہیں ہے۔ دلوں کو بھی مسخر کرنے کی ضرورت ہے اور اس کے لیے محکوم قوموں کی زبان اور ثقافت سے بھی آشنا ضروری ہے۔ اجنبیت اور مغائرت کو کم کرنے کے لیے ترجموں کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔

علم کی وسعت اور علمی اور سائنسی دریافتوں کی کثرت سے بنی نوعِ انسان کو فائدہ پہنچانے میں ترجموں نے بڑی مدد کی ہے۔ یورپ کے نشاۃ ثانیہ میں عربی کے تراجم کا بھی ہاتھ ہے۔ ترجمہ وہ کنجی ہے جس کے ذریعہ علوم و فنون کے خزانے سب کے لیے کھل جاتے ہیں۔

کھل جاتے ہیں۔ اسی لیے روز بروز ترجموں کی اہمیت بڑھتی جا رہی ہے اور ترجمے نے بھی تخلیق کا درجہ پا لیا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ترجمہ خواہ کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو اس میں اصل کے تمام محاسن آ ہی نہیں سکتے۔ یہ بات مشرقی ترجمے کے لیے یا ان زبانوں کے لیے تو ٹھیک ہے۔ جو ابھی ترقی یافتہ نہیں ہیں جو ہر قسم کے معانی و مطالب کے اظہار پر قادر ہوں مگر دنیا کی ترقی یافتہ زبانیں اب اس مرحلے پر پہنچ گئی ہیں کہ وہ کم از کم نثری تخلیقات کو بعینہٖ دوسری زبانوں میں منتقل کر سکیں۔ کسی دوسری زبان سے براہ راست استفادہ کرنے والے ہمیشہ تھوڑی تعداد میں ہوتے ہیں لہٰذا ترجمے کی ضرورت ہمیشہ باقی رہے گی کیونکہ کالی داس، عمر خیام، اقبال اور ٹیگور کی عظمت کا اعتراف ترجموں کی بدولت ہی ہوا ہے۔

مغلیہ دور میں سنسکرت سے فارسی میں کافی ترجمے ہوئے انگریزوں کی آمد کے بعد انگریزی سے مقامی زبانوں میں ترجموں کا سلسلہ شروع ہوا۔ فورٹ ولیم کالج میں انگریزی سے کسی کتاب کا ترجمہ اردو میں نہیں ہوا لیکن عربی اور فارسی اور سنسکرت کے تراجم ضرور ہوئے انگریزی سے اردو میں ترجمہ شدہ پہلی کتاب "انجمن شلر کا انجیل مقدس" ہے جو ۱۸۰۴ء میں شائع ہوئی۔ بعدہٗ مرزا فطرت نے دل ہنیر کی مدد سے ۱۸۰۵ء میں انجیل کے "عہدِ جدید" کا ترجمہ شائع کیا۔ بعد میں اکا دکا انفرادی کوششیں ہوتی رہیں۔ بعد میں امراء اور نوابین نے جو جدید علوم کی اشاعت اور فروغ میں دلچسپی رکھتے تھے۔ ترجموں کی سرپرستی کی۔ جیسے حیدرآباد کے نواب فخر الدین خاں شمس الامراء کی کوششوں سے بعض رسالے شائع ہوئے۔ رسالہ مختصر جر ثقیل، رسالہ کسورات اعشاریہ، رسالہ اسطرلاب، کرۃ، کیمسٹری کا مختصر جو رسالہ شاہان اودھ نے بھی بعض کتابوں کے ترجمے کرائے۔ اور مطبع سلطانی سے شائع کیے۔ جیسے رسالہ ہیئت رسالہ علوم طبعیہ، رسالہ قوت مقناطیس، رسالہ علم الحرارۃ، رسالہ علم المناظر وغیرہ لیکن ترجموں کی پہلی باضابطہ کوشش دہلی کالج میں ہوئی۔ کیونکہ مغربی علوم کے پڑھانے میں سب سے بڑی دقت یہ تھی کہ اردو میں کتابیں دستیاب نہیں تھیں۔ لہٰذا "انجمنِ اشاعتِ علوم بذریعہ السنہ ملکی" یا "دہلی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی" قائم ہوئی جس کا مقصد یہ تھا کہ جدید کتابوں کی تالیف

اور ترجمے کے ذریعے، ہندوستانی زبانوں کو ترقی دی جائے۔ انجمن نے ترجمے کے لیے جو قاعدے مقرر کیے تھے ان کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

۱۔ مترادف لفظ اردو میں نہ ملے تو اصل لفظ استعمال کیا جائے۔

۲۔ سائنس کی کتابوں کا ترجمہ انگریزی سے ہوگا۔ اس لیے انگریزی الفاظ کا استعمال ناگزیر رہے۔

۳۔ ترجمہ لفظی نہ ہو بلکہ اس کا مفہوم اردو میں ادا کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس ادارے میں بہت سی کتابوں کا ترجمہ ہوا۔ غدر کے ہنگامہ میں یہ کالج بند ہوگیا اور پھر نہ کھلا۔ اس کے بعد دوسری قدرے منظم کوشش سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی کے تحت ہوئی اور تاریخ جغرافیہ، سائنس اور معاشیات کی متعدد کتابیں ترجمہ ہوئیں اس کے بعد زمانے میں انگریزی تعلیم کے عام ہوجانے کی وجہ سے بہت سے مترجم پیدا ہوگئے لیکن یہ تراجم زیادہ تر ناولوں ڈراموں، کہانیوں کے تھے ذریعہ تعلیم انگریزی تھا اسی نصابی ضرورتوں کے لیے ملکی زبان میں علوم کی کتابوں کی ضرورت نہیں رہ گئی تھی۔

دراصل اردو میں سب سے منظم اور باضابطہ کوشش جامعہ عثمانیہ کے قیام (۱۹۱۷ء) کی بعد شروع ہوئی۔ کیونکہ جامعہ عثمانیہ نے ذریعہ تعلیم اردو کو قرار دیا تھا۔ جامعہ عثمانیہ میں "سررشتہ تعلیم و ترجمہ" قائم ہوا۔ جس کے تحت ۵۰۰ کے قریب کتابیں ترجمہ ہوئیں۔ یہ کتابیں آرٹس اور سائنس، انجینیرنگ اور میڈیسن تقریباً تمام جدید علوم پر حاوی تھیں۔ ہندوستان کی کسی زبان میں اعلیٰ تعلیم دینے کا یہ پہلا تجربہ تھا جو بحیثیت مجموعی کامیاب رہا۔

دارالترجمہ میں دو طرح کے رکن تھے۔ ایک وہ جو مستقل اس کے رکن تھے۔ اور دوسرے وہ جو اجرت پر کام کرتے تھے۔ ترجمے کی تکمیل کے بعد کسی ماہر فن سے اس پر نظر ثانی کرائی جاتی اور پھر ادبی ناظر زبان و بیان کی اصلاح کے لحاظ سے نظر ثانی کرتے اور کتاب شائع ہوجاتی ترجمہ کے دوران مترجمین ایسے الفاظ اور اصطلاحات کی فہرستیں متعلقہ مجالس وضع اصطلاحات میں بھیجتے تھے جن کے مترادف الفاظ اردو میں نہیں تھے۔ اس مجلس کے اراکین میں علم کے ماہرین کے علاوہ عربی، فارسی، اردو اور ہندی میں دستگاہ رکھنے والے بھی شامل

ہوتے تھے۔ جو زبان کی ادبی اور لسانی خصوصیات کو مدنظر رکھتے تھے۔ اردو کے دامن کو مالامال کرنے میں دارالترجمہ نے بڑا نمایاں حصہ لیا ہے۔

ترجمہ کے سلسلے میں سب سے پہلی مشکل اصطلاحات کے سلسلے میں پیش آتی ہے یہ مشکل سائنسی علوم کے سلسلے میں زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ کیونکہ ہر اصطلاح ایک معین معنی دیتی ہے۔ اور اس کے لیے ایسا متبادل لفظ ہونا چاہیے جو وہی مخصوص معنی دیتا ہو۔ مثلاً Treaty — Agreement کے لیے اردو میں سمجھوتہ یا معاہدہ استعمال ہوتا ہے۔ یہ طے نہیں ہے کہ Agreement کے لیے معاہدہ اور Treaty کے لیے سمجھوتہ ہی استعمال ہوگا۔ لہٰذا جس کا جو جی چاہتا ہے استعمال کرلیتا ہے۔ یہ سہولت سائنس میں نہیں ہے اسی طرح قوانین اور قانون کی کتابوں یا عدالتوں کے فیصلوں کے ترجموں کے لیے بھی مخصوص اور معین الفاظ کی ضرورت ہوتی ہے لہٰذا جہاں کہیں بھی ترجمے ہوئے اصطلاحات سازی بھی ہوئی۔ دارالترجمہ حیدرآباد نے وسیع پیمانے پر اصطلاحات وضع کیں مولانا وحیدالدین سلیم نے اپنی بیش بہا تصنیف "وضع اصطلاحات" مرتب کی اور پہلی بار اصطلاحات وضع کرنے کے اصول مدون کیے۔ جو آج بھی اتنے ہی کارآمد ہیں۔

اصطلاحات سازی کے سلسلے میں بعض ماہرین کا کہنا ہے کہ اصطلاحات کا ترجمہ نہیں کرنا چاہیے۔ ان کا کہنا ہے کہ انگریزی زبان کی اصطلاحوں کو تقریباً بین الاقوامی اصطلاحوں کا درجہ حاصل ہوگیا ہے۔ لہٰذا ان کو جوں کا توں اپنا لینا چاہیے۔ لیکن یہ صورت قابلِ عمل نہیں ہے۔ کیونکہ اصطلاحوں سے جو مشتقات بنتے ہیں ان کو اردو میں جوں کا توں اپنا لینے سے بڑی قباحت پیدا ہوجائے گی۔ اس کے علاوہ اب اصطلاحوں کی اتنی کثرت ہوگئی ہے کہ اردو میں ان کے بے محابا استعمال سے عبارت بڑی عجیب و غریب ہوجائے گی۔ لہٰذا انھیں انگریزی اصطلاحوں کو اپنانا چاہیے جو آسانی سے اردو میں کھپ سکیں۔

ترجمے کے سلسلے میں بنیادی اور اولین شرط یہ ہے کہ جس زبان سے ترجمہ کرنا ہو اور جس زبان میں ترجمہ کرنا ہو دونوں پر قدرت حاصل ہو۔ صرف اسی حد تک نہیں کہ دونوں کے مطالب سمجھ میں آجائیں بلکہ زبان کی ساخت، مزاج اور اس کے تہذیبی پس منظر سے بھی اچھی آگاہی ہو۔

www.rekhta.com

عام طور پر اردو میں جو ترجمے دیکھنے میں آتے ہیں وہ ادھ کچرے سے ہوتے ہیں اور پڑھنے والا فوراً سمجھ جاتا ہے کہ عبارت کا لفظی ترجمہ ہوا ہے۔ کیوں کہ زبان اکھڑی اکھڑی سی ہوتی ہے اور جملوں کی ساخت بھی انگریزی جملوں کے مطابق ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ ترجمہ لفظ کا نہیں مفہوم کا کیا جاتا ہے۔ یا دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اگر کسی بات کو اپنی زبان میں کہیے تو کس طرح کہیے۔

یوں تو ہر معاملے میں عقل اور تعلیم کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر مترجم کے لیے تو یہ شرط کی حیثیت رکھتی ہے عام طور پر ڈکشنری میں ایک لفظ کے کئی معنی دیے ہوتے ہیں۔ اب سیاق وسباق کے مطابق مترجم صحیح لفظ کا انتخاب کرتا ہے اس کے لیے استعداد اور لیاقت تو خیر ضروری ہے ہی مگر سمجھ داری کی بھی بڑی اہمیت ہے مثلاً ایک جگہ ایک ترجمہ دیکھا:

I solemnly dedicate myself for the service of the nation.

"میں انتساب سے قوم کی خدمت کا عہد کرتا ہوں"

اب Dedicate کے معنی انتساب کے بھی ہیں مگر یہاں اس کا محل استعمال نہیں ہوگا۔ جنگ کے زمانہ میں ایک ترجمہ اس طرح کیا دیکھا کہ "ہوا باز بحفاظت تمام طیارے کو واپس لے آیا حالانکہ اس کی نظر کمزور تھی" نظر کمزور تھی" انگریزی کے ان الفاظ کا ترجمہ تھا Though the visibility was poor عقل سلیم سے معلوم ہو جائے گا کہ ایسا شخص ہوا باز نہیں بن سکتا جس کی نظر کمزور ہو۔ بعض دفعہ سیاق کو صحیح نہیں سمجھنے سے ترجمہ غلط ہو جاتا ہے مثلاً:

A Muslim required to perfoorm Haj without causing distress to his family

"مفہوم یہ ہے کہ کسی مسلمان پر حج اس وقت فرض ہے جب اس کے فریضۂ حج پر چلے جانے سے اس کے خاندان کے لوگ کسی طرح کی مالی مشکلات میں نہ پھنس جائیں" مگر ایک مترجم نے اس کا ترجمہ یوں کیا تھا "خاندان کو تنگ کیے بغیر حج کو جا سکتا ہے" بعض دفعہ عبارت کو صحیح نہ سمجھنے سے بالکل غلط ترجمہ ہو جاتا ہے۔ جیسے: Hold fast to truth کا ترجمہ سچائی کے لیے برت رکھنا۔ بعض دفعہ مترجم بالکل نااہل ہوتا ہے جیسے: Outstanding

scientist کا ترجمہ باہر کھڑے ہوئے سائنسداں" یا steel plants "فولاد کے پودے" اس طرح کی بہت مثالیں دی جا سکتی ہیں۔

ترجمہ محض ایک زبان کے خیالات کو دوسری زبان میں پلٹ دینے کا نام نہیں ہے بلکہ خیالات اور احساسات کو اس ترتیب کے ساتھ منتقل کرنے کا نام ہے کہ مصنف نے کس جگہ پر زور دیا ہے۔ کہاں پر طنز ہے۔ کہاں پر محاورہ یا روزمرہ ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ صحیح ہے کہ ترجمے میں اصل کی ساری خوبیاں نہیں پیدا کی جا سکتیں لیکن بہت سی خوبیاں ضرور سمو دی جا سکتی ہیں۔

اردو میں اچھے ترجموں کی کمی رہی ہے۔ خصوصاً علمی اور سائنسی موضوعات کے اچھے ترجمے کمیاب ہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ رہی ہے کہ اردو ذریعہ تعلیم کبھی نہیں رہی جب جامعہ عثمانیہ نے اردو کو ذریعہ بنایا تو وہاں خاصی تعداد میں ۵۰ سو کے لگ بھگ، کتابوں کے ترجمے ہوئے۔ اور اب ترقی اردو بورڈ کے ذریعہ سیکڑوں کتابیں ترجمہ کرائی جا رہی ہیں۔ اس سلسلے میں مترجمین کو جو مشکلات پیش آ رہی ہیں وہ وہی ہیں۔ جن کا ذکر اوپر آچکا یعنی اصطلاحات کی کمی، اچھی انگریزی اردو ڈکشنری کی عدم موجودگی۔ عبدالحق صاحب کی ڈکشنری ۱۹۳۶ء میں تیار ہوئی تھی۔ اس کے بعد سے لاکھوں الفاظ آگئے ہیں۔ یا الفاظ کے معنی اور استعمال بدل گئے ہیں۔ کسی اچھے نمونے کی کمی پھر اردو کی اپنی نارسائی۔

فی الحال ترقی اردو بورڈ وسیع پیمانے پر علمی اور سائنسی موضوعات پر تراجم کرا رہا ہے اس سلسلے میں تقریباً ہر موضوع کے مترجمین کو جامعہ عثمانیہ کے دارالترجمہ کی وضع کردہ قدیم اصطلاحات مہیا کر دی گئی ہیں لیکن گزشتہ بیس سال کے عرصے میں سائنس اور علوم نے اتنی ترقی کی ہے جتنی کہ پچھلے دو سو برس میں نہیں کی تھی۔ اور نہ صرف اصطلاحوں میں بے انتہا اضافہ ہوا ہے بلکہ اصطلاحوں کے معنی تک بدل گئے لہٰذا عثمانیہ کی اصطلاحیں ہماری رہنما ثابت ہو سکتی ہیں اور بے شک ایک مثال کے طور پر کام دے سکتی ہیں۔ لیکن ہمارے لیے مکتفی نہیں ہو سکتیں ہمیں تو آج خود کنواں کھود کر پانی پینا ہے۔

ترجمہ ایک مستقل فن ہے۔ جو بڑی ریاضت چاہتا ہے۔ اخبار، ریڈیو اور اب تدریسی

ضرورتوں کے تحت اردو ترجموں کی مانگ بڑھتی جا رہی ہے ایک دو یونیورسٹیوں میں ترجمے کے شعبے کھل گئے ہیں۔ ضرورت ہے کہ مزید یونیورسٹیوں میں شعبے کھلیں۔ اردو بورڈ کی ترجمہ کردہ کتابوں اور اصطلاحوں سے اس کام میں بہت مدد ملے گی۔

ہندوستان میں متعدد زبانیں رائج ہیں۔ ان میں بہت سی بڑی قدیم اور ترقی یافتہ زبانیں ہیں۔ قومی ہم آہنگی اور ملک کے دوسرے حصوں میں رہنے والوں کے رسم و رواج اقدار اور ثقافت کو سمجھنے کے لیے ہندوستان کی مختلف علاقائی زبانوں کے اچھے ادب کا متعدد زبانوں میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ لیکن ایسے ترجمے بھی زیادہ تر انگریزی کی مدد سے کیے گئے ہیں۔ اردو جاننے والوں میں ایسے لوگوں کی کمی ہے جو براہ راست دوسری علاقائی زبان سے ترجمہ کر سکیں۔

ہندی سے اردو میں تراجم کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ ہندی نہ صرف مرکزی حکومت کی بلکہ شمالی ہندوستان کی متعدد ریاستوں کی سرکاری زبان ہے۔ ہندی کی تعلیم لازمی ہے۔ لہٰذا اردو جاننے والوں میں ہندی سے واقفیت رکھنے والوں کی کمی نہیں ہے۔ چونکہ ہندی کی زیادہ تر اصطلاحیں، سنسکرت سے لی گئی ہیں۔ اس لیے مشکل یہ ہے کہ ہندی کا عمومی جانکار ان اصطلاحوں کو سمجھ نہیں پاتا۔ اس مشکل کو دور کرنے کے لیے ایک ایسی ڈکشنری کی ضرورت ہے۔ جن میں ہندی اصطلاحوں کے اردو متبادل دیے گئے ہوں۔ بہار اور یوپی میں جو اردو مترجم مقرر کیے گئے ہیں انھیں ایسی ہی مشکل پیش آتی ہے۔ مترجموں کے پاس جو درخواستیں اردو میں آتی ہیں ان میں زیادہ تر محکمہ مال، لگان، مالگذاری اور انتظامی امور سے متعلق اصطلاحیں ہوتی ہیں۔ زیادہ تر اصطلاحیں مغلوں کے زمانے سے رائج ہیں۔ لیکن ان کی جگہ ہندی اصطلاحیں رائج کی گئی ہیں۔ ایسی تمام اصطلاحوں کو اگر جمع کیا جائے تو ان کی تعداد دو ڈھائی ہزار سے زیادہ نہ ہوگی۔ لہٰذا اردو۔ ہندی کی ایسی لغت جو خاص طور سے اردو مترجموں کے لیے تیار کی گئی ہو وقت کی اہم ضرورت ہے۔ یہ کام ریاستی اکادمیاں بہ آسانی کر سکتی ہیں۔

جیلانی کامران

ترجمے کی ضرورت[1]

"ترجمے کی ضرورت" اس موضوع کے ساتھ ہی میرا ذہن شاہ عبدالقادر کے ترجمے کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ اور جو سوال اٹھتا ہے یہ ہے کہ شاہ عبدالقادر کو قرآن کریم اردو میں ترجمہ کرنے کی کیوں ضرورت پڑی تھی۔ بات شاہ عبدالقادر ہی پر ختم نہیں ہوتی۔ ان سے پہلے یورپی مشنریوں نے بائبل کا اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ اور کچھ یوں لگتا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ عیسائی مشنریوں اور شاہ عبدالقادر، دونوں کا ترجمے کے بارے میں مقصد اور نقطۂ نظر یکساں تھا اور وہ ایک عام آدمی تک خدا کی بھیجی ہوئی کتاب کے مفہوم اور پیغام کا پہنچانا تھا۔ جسے بعض مشکلات کے باعث عام آدمی جانتے اور جان کر محسوس کرنے سے قاصر تھا۔ کیوں کہ قرآن کریم کی زبان عربی تھی (اور ہے)، اور وہ بائبل جسے یورپی مشنری ترجمہ کر کے پھیلانا چاہتے تھے بعض اوقات ڈچ زبان اور عموماً انگریزی میں دستیاب ہوتی تھی۔ ترجمے کی ایسی ضرورت۔ جو اس ضمن میں نظر آتی ہے خالصتاً مذہبی تقاضوں سے پیدا ہوتی ہے اور پیغام الٰہی کی نشر و اشاعت کا ذمہ لیتی ہے۔ لیکن جب ہم تاریخ کی کتابوں میں عباسیوں کے زمانے کے تراجم کا ذکر پڑھتے ہیں اور پتہ چلتا ہے کہ سریانی یونانی اور سنسکرت زبانوں کا علم اور فلسفہ عربی زبان میں منتقل ہوا تھا تو پھر وہی سوال اٹھتا ہے کہ عباسی دور کے عالموں کو پرانی کتابوں اور علوم کو عربی میں ترجمہ کرنے کی ضرورت کیوں پڑی تھی اور یہی سوال ان کتابوں کے بارے میں بھی اٹھتا ہے۔ جنھیں مغلیہ دور کے عالم فارسی میں ترجمہ کرتے تھے۔ ترجمے کی ایسی ضرورت خالصتاً علمی تقاضوں سے پیدا ہوتی ہے اور انسانی ذہن کی

---

[1] مشمولہ "تنقید کا نیا پس منظر" مکتبہ ادب جدید۔ ۱۹۶۴ء

www.kitaabistan.com

نشوونما کا باعث بنتی ہے۔

اس صداقت کو سب مانتے ہیں کہ ترجمے کا عمل اس وقت تک کارآمد نہیں ہو سکتا جب تک کہ مقابلے میں کوئی دوسری زبان نہ ہو۔ ایک ایسے علاقے میں جہاں لوگ ایک لسانی وحدت ہوں وہاں ترجمے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا جب تک دو لسانی وحدتیں باہم سامنے نہ ہوں اور دونوں کے درمیان رابطہ نہ ہو، ترجمے کا عمل ظاہر نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ بات بھی درست ہے کہ زبانیں، لفظوں سے مل کر اور لفظوں کے مجموعے سے بنتی ہیں۔ اور غالباً کوئی بھی لفظ ایسا نہیں ہے جس کا مطلب یا معنی نہ ہو۔ اس لیے جب دو لسانی وحدتیں باہم عمل پیرا ہوتی ہیں۔ تو نہ صرف متاثر ہونے والی زبان کے الفاظ ہی اس عمل میں شریک ہوتے ہیں بلکہ اس زبان اور لسانی وحدت کے معانی بھی دوسری زبان میں منتقل ہونے لگتے ہیں ایک سطح پر ترجمے کا عمل متاثر ہونے والی زبان کے ذخیروں کو آزماتا ہے۔ اور دوسری سطح پر اس لسانی وحدت کے علمی اور ثقافتی تصورات میں اضافہ بھی کرتا ہے۔ اس طرح ترجمے کے عمل کے ساتھ قوموں کی علمی تاریخ پھیلتی اور بڑھتی ہے۔ اور ان کی زبانیں اس علمی تاریخ کو محفوظ کرتے ہوئے وہ تمام منزلیں بھی طے کرتی ہیں جنھیں ہم بچپن، بلوغت اور جوانی کے ناموں سے پکارتے ہیں۔ اور جب زبانیں پختہ ہو جاتی ہیں اس وقت وہ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ذہنی اور علمی پختگی کو قائم کرنے میں معاون بھی ثابت ہوتی ہیں

ترجمے کے عمل کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ایک عجیب بات دکھائی دیتی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ غیر ادبی تصانیف کا ترجمہ دراصل ایک زبان کی لسانی موت سے پیدا ہوتا ہے اور دوسری زبان کی لسانی افزائش کا باعث بنتا ہے۔ "لسانی موت" کی ترکیب قابلِ غور ہے۔ میں نے اسے استعارۃً استعمال کیا ہے۔ کیوں کہ ہم جس زبان سے ترجمہ کرتے ہیں اس کے الفاظ ہمیں عزیز نہیں ہوتے۔ اور نہ ہمیں اس کی لسانی خوبیوں سے کوئی تعلق ہوتا ہے۔ ہمیں لفظوں کی شکل و صورت، ان کے تلفظ، اور ان کے حسن اور موسیقی سے کوئی دل چسپی نہیں ہوتی۔ دل چسپی ہوتی ہے تو صرف اس مغز سے جو لفظوں کا لباس پہنے لفظوں کے پرے کسی طلسمی راز کے طور پر موجود ہوتی ہے۔ ہم اسے برآمد کرنے اور اپنی زبان میں کامیابی

اور ایمان داری سے منتقل کرنے کے لیے الفاظ کے سب ناطے اور اصل زبان کے سلسلے فراموش کر دیتے ہیں۔ اور یوں سمجھتے ہیں کہ اصل زبان مر چکی ہے اور ہم اس کے جادو سے اپنی زبان کو زندہ کرنا چاہتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب یورپ کے لوگ ارسطو اور افلاطون کو اصل یونانی میں پڑھتے تھے۔ لیکن ترجمے کے ساتھ ہی ارسطو اور افلاطون یورپی قومی زبانوں میں دوبارہ جی اٹھتے ہیں۔ اور کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو ارسطو کی شعریت پڑھنے کے لیے اصل یونانی کی طرف جاتا ہو۔ سب کے سب جب ارسطو کا نام سنتے ہیں، بوچر اور انگرم بائیواٹر ہی تک پہنچتے ہیں۔ اور یہاں جس ارسطو سے متعارف ہوتے ہیں وہ زندہ ارسطو ہے جو یونانی زبان کے ارسطو کی وفات سے رونما ہوا ہے۔ اس حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے جب ہم ترجمے کی ضرورت پر غور کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ ہم ترجمے کے عمل کے ذریعے ان زبانوں کی علمی برتری کو ختم کرنا چاہتے ہیں جن کی علمی برتری ہمیں پریشان کرتی ہے۔ اور اس طرح اپنی زبان کو وہی قامت، گہرائی اور پھیلاؤ دینا چاہتے ہیں جو یورپ کی قومی زبانوں کو آج حاصل ہے لیکن کچھ صدیاں پہلے وہی فضیلت لاطینی اور یونانی کو حاصل تھی۔

غالباً ہر زبان علمی تحقیق کے فرائض کو سرانجام دیتے ہوئے گھبراتی ہے کیوں کہ زبانیں قوموں اور اشخاص کی طرح اس دور میں ابتدائی تربیت حاصل کرتی ہیں۔ جس دور میں لوگ شعر کہتے ہیں اور ان کے عالم شعری کا طرز فلسفہ اور علم دریافت کرتے ہیں۔ جس طرح بچپن اور جوانی کے بعد انسانی زندگی میں پختگی کا دور آتا ہے اور قومیں تصورات اور علمی تحقیق کی طرف رجوع کرتی ہیں۔ اسی طرح زبانیں بھی شعری دور سے باہر نکل کر سائنسی دور میں داخل ہوتی ہیں۔ اور مناسب تربیت نہ ہونے کی وجہ سے سائنسی اور فلسفیانہ ذمہ داریوں کو نبھانے میں ہچکچاہٹ اور گھبراہٹ محسوس کرتی ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نئی ظاہر ہونے والی زبانوں کی تربیت کے کون سے طریقے ہیں؟ اور ان کی گھبراہٹ کو کس طریقے سے دور کیا جا سکتا ہے؟ ان سوالوں کا جواب ترجمہ ہے۔ ترجمے کے ذریعے زبانیں تجربہ اور اعتماد حاصل کرتی ہیں۔ اور کسی بڑی اور وسیع زبان کو اپنے قالب میں سمو کر وہ یقین اور خود اعتمادی پا لیتی ہیں جو ترجمے کی مشق اور کوشش، تربیت اور کامیابی کا واضح نتیجہ ہیں۔

ترجمے کے ذریعے زبان کئی طرح پھلتی اور پھولتی ہے۔ اور اس کی کئی طرح کی خوبیاں ترجمے کے مضامین کے حوالے سے پیدا ہوتی ہیں۔ وہ ایک وقت میں علم الشعر کو بیان کر سکتی ہے۔ اور دوسرے وقت میں وہی زبان فلسفے کی زبان بھی بن سکتی ہے۔ اسی زبان میں طب کی باتیں کی جا سکتی ہیں۔ اور وہی زبان ٹریفک کے اصولوں کی، بچوں کی نظموں اور قانون کی زبان بھی بن سکتی ہے۔ لوگ اسی کے ذریعے ریاضی کے مسائل حل کرتے ہیں۔ اور سائنس کے طالب علم ٹھوس، مائع اور گیس کی باتیں کرتے ہیں۔ نفسیات، عمرانیات، اکنامکس، تاریخ اور دقیق علمی مسائل بھی زبان ہی کے ذریعے بیان کیے جاتے ہیں۔ لیکن شرط زبان کے تجربے اور تربیت کی ہے۔ اگر زبان میں خود اعتمادی ہے اور اسے مناسب مشق حاصل ہے تو کوئی بھی موضوع ایسا نہیں ہے جسے وہ بیان نہ کر سکتی ہو اور اپنی لپیٹ میں لے لینے سے قاصر ہو۔

یہ تو وہ باتیں ہیں۔ جو ایک دوسری زبان کے قالب میں موجود رہنے والے تصورات سے تعلق رکھتی ہیں۔ یعنی ایسی چیزیں ہیں جنھیں لفظوں کے پردے سے باہر نکالا جا سکتا ہے اور اصل لفظوں کے حوالے کے بغیر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ایسی صورت حال میں الفاظ کی خوب صورتی اور زبان کی جمالیاتی اور فنی خوبیوں پر زور نہیں دیا جاتا۔ ترجمے کا عمل اس حالت میں، صرف علمی اثاثے کی نشوونما میں حصہ لیتا ہے۔

ترجمہ جہاں الفاظ کے ذریعے انسانی علوم میں اضافہ کرتا ہے اور ذہن کی سرحدوں کو کشادہ کرنے میں مدد دیتا ہے اور اس میں ترجمے کی تمدنی اور ثقافتی ضرورت بھی مضمر ہوتی ہے، وہاں ترجمے کا عمل زبان کی ساخت کو بھی متاثر کرتا ہے۔ خیالات اور جذبات کو بیان کرنے کے لیے نئے اسلوب مل جاتے ہیں۔ نئے الفاظ وضع کرنا پڑتے ہیں۔ پرانے الفاظ کو دوبارہ استعمال کرنے سے ان میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ نئے محاورے اور نئے محرکات دستیاب ہوتے ہیں۔ اور نئے علوم سے آشنائی ہوتی ہے۔ علاوہ ازاں نئی نئی اصناف کے ساتھ ذہن کا تعارف ہوتا ہے۔ اور فکر اور تحقیق کے لیے نئے سانچے، اور نئے اسالیب مل جاتے ہیں۔

یہ بات مجھے زبان کے مزاج کی طرف لے جاتی ہے۔ بعض زبانیں کرخت اور سنگلاخ

ہوتی ہیں جن میں میٹھی اور دل کش باتوں کو بیان کرنے کی صفت نہیں ہوتی۔ وہ اپنے مزاج کے مطابق بولی جا سکتی ہیں۔ اور ان کا مزاج ایک ہی سطح پر کارآمد ہوتا ہے۔ ایسی زبان ایک مخصوص طرز کی شاعری پیدا کر سکتی ہے۔ اور جس جذبے کو صورت دینے کے قابل ہوتی ہے وہ اسی مزاج ہی کے مطابق ہوتا ہے۔ کچھ ایسی حالت انگریزی زبان کی تھی۔ جب بائبل کا ابھی اس زبان میں ترجمہ نہیں ہوا تھا۔ سٹائل کے لحاظ سے انگریزی نثر روسی انشا پردازوں کے زیر اثر تھی۔ اور پرانی انگریزی کا اسلوب کہانیوں ہی کے لیے کارآمد سمجھا جاتا تھا۔ ادبی طرز کا ایک اسلوب شان و شکوہ کا تھا۔ لمبے بلند آہنگ جملے، قواعد اور علمیت کے مظاہرے اس طرز کے اسلوب سے پیدا ہوتے تھے۔ اس اسلوب میں روسی قیصر کا دبدبہ تھا مگر دل کی آگ نہ تھی۔ مگر دوسری طرح کا سٹائل شان و شکوہ سے کہیں زیادہ متانت اور سلاست کا سٹائل تھا۔ جس کے فقرے مختصر اور چست تلے ہوتے تھے۔ تیسری طرز کا سٹائل پرانی انگریزی کا سٹائل تھا۔ جسے گو لاطینی کے انشا پردازوں کی حمایت حاصل نہ تھی مگر گرجا کے عہدیدار اسے استعمال کرنے کے عادی تھے۔ احیائے علوم کی تحریک سے پہلے اسے مذہبی لیکچروں میں استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ اسلوب شعری طبیعت کا اسلوب تھا اور اس میں سیدھی سادی باتیں کہی جا سکتی تھیں۔ لیکن اس میں گہرائی نہ تھی۔

اسی صورت حال کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ احیائے علوم کی تحریک کے زمانے کی انگریزی نثر روسی اور قدیم انگریزی اجزا سے مل کر بنتی تھی۔ لیکن انگریزوں کی ثقافتی اور فکری شخصیت خالصتاً ان اجزا کے مجموعے سے مرتب نہ ہوتی تھی۔ عبرانی اجزا بھی اسی شخصیت کا حصہ تھے مگر ابھی تک نثر میں نمودار نہ ہوئے تھے۔ بائبل کا انگریزی میں ترجمہ دراصل انگریزی نثر میں عبرانی اجزا کی شمولیت کا واقعہ ہے۔ عبرانی جملے کی شکل، قدیم انگریزی اور رومن جملے کی شکل سے مختلف تھی۔ عبرانی کا ایک جملہ، ایک ہی وقت میں تکرار اور مکرر تکرار کے ساتھ جملے کی واقعیت کو شاعری کی سرحدوں میں پھیلا دیتا تھا۔ اور جملے کا مفہوم عالم گیر خصائص اختیار کر لیتا تھا۔ نثر مختلف استعاروں کی مدد سے ایک ایسا شعری تجربہ پیش کرتی تھی۔ جو پیدا تو جسم اور حواس کے جغرافیے سے ہوتا تھا مگر پیدا ہوتے ہی غیر مرئی اور غیر مادی شکل اختیار کر لیتا

تھا۔ ان باتوں کے علاوہ بائبل کا مزاج شمالی یورپ اور قدیم اٹلی کے مزاج سے مختلف تھا۔ اس کے جذبات کا رنگ گہرا اور اس کی تاثیر فوری تھی۔ بائبل کی نثر شاعرانہ تھی، جو قدیم انگریزی اور رومن نثر سے مختلف تھی۔

انگریزی نثر کی خوب صورتی جس میں کلیسا کے بڑے عہدیدار، سیاسی زندگی کے مقرر اور کارلائل شامل ہیں، اسی عبرانی انداز کی بدولت ہے۔ مگر بائبل کا ذکر کرنے سے میرا مقصد ترجمے کی اس خوبی سے ہے جو ترجمہ کرنے سے کسی زبان میں پیدا ہوتی ہے۔ دوسری زبان کے جملے کی ساخت، اس کی تشبیہیں اور استعارے، اسی زبان کا سوز، یہ باتیں مل کر اثر قبول کرنے والی زبان کی صلاحیتوں کو اجاگر کرتی ہیں۔ اور اسے وہ رنگ دیتی ہیں جو پہلے اس کے پاس نہیں ہوتا۔ جو باتیں انجیل کے ترجمے سے متعلق ہیں، شاہ عبدالقادر کے ترجمے پر بھی ٹھیک بیٹھتی ہیں۔ اردو زبان، جو آج ہر لحاظ سے ہمارے کلچر اور علوم کی زبان ہے ایسی عظمت اور وسعت حاصل نہ کر سکتی اگر اسے فورٹ ولیم کالج، برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی اور شاہ عبدالقادر کے ترجمے کی حمایت حاصل نہ ہوتی۔ اگر ہم اردو شاعری کی زبان کا مقابلہ شاہ عبدالقادر کے ترجمے کی نثر سے کریں تو ہمیں ترجمے کی خوب صورتی اور تاثیر واضح طور پر نظر آئے گی۔ اس سے میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ جو عظمت اور کلاسیکی شوکت اصل عربی میں ہے وہی ترجمے کی اردو میں ہے۔ فرق تو ضرور ہے لیکن یہ کوئی کم فخر کی بات نہیں ہے کہ اس زمانے کی اردو نے عربی کے وسیع مفہوم اور معانی کے سمندر کو اپنے کمزور اور شرمیلے قالب میں سمیٹنے کی کوشش کی تھی۔ اور اس میں کامیاب ہوئی تھی۔ تاہم یہ بتانے کے لیے کہ ایک زبان دوسری زبان کے محاورے کو اپنے طور اور طریق پر کس طرح ڈھالتی ہے میں سورہ قیامہ کی چند آیات کا ترجمہ نقل کرتا ہوں:

"قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی اور قسم کھاتا ہوں جی کی جو اُلہنا دیتا ہے۔ کیا خیال رکھتا ہے آدمی کہ ہم جمع نہ کریں گے اس کی ہڈیاں، کیوں نہیں۔ سکتے ہیں ہم، پوچھتا ہے کب ہے دن قیامت کا۔ پھر جب چندلانے لگے تیور، اور گہہ جاوے چاند اور اکٹھے ہوں سورج اور چاند، کہے گا اس دن آدمی، کہاں جاؤں بھاگ کر کوئی نہیں، کہیں

نہیں۔ بچاؤ۔ پھر مقرر ہمارے ذمہ ہے اس کو کھول بتانا، کوئی نہیں پر تم چاہتے ہو شتاب ملنے کو اور چھوڑتے ہو دور آنے کو، کتنے منہ اس دن تازے ہیں، اپنے رب کی طرف دیکھتے۔ اور کتنے منہ اس دن اداس ہیں، خیال میں ہیں کہ ان پر ہووے جس سے کمر ٹوٹے، کوئی نہیں۔ خرابی تیری تس پر پھر خرابی تیری، خرابی پر خرابی تیری۔ کیا خیال رکھتا ہے آدمی کہ چھوٹا رہے گا بے قید!"

(شاہ عبدالقادر کا ترجمہ، الٰہ آباد مشن پریس ۱۸۴۴ء)

اس ترجمے کی انفرادیت جملے میں الفاظ کی مخصوص نشست سے پیدا ہوتی ہے۔ الفاظ اپنی نشست اپنے اصل عربی متن سے اخذ کرتے ہیں اور اس طرح عربی گرامر اور اردو گرامر کے اتصال سے جو جملہ رونما ہوتا ہے وہ اس ترجمے کا جملہ بن جاتا ہے۔ اسی ترجمے کو دیکھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ ترجمہ کرتے وقت مترجم نے عالمانہ زبان کو اپنے اوپر وارد نہیں ہونے دیا۔ اور ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ شاہ عبدالقادر فارسی انشا پردازی سے ناواقف تھے۔ انھوں نے ترجمے کے لیے اس زبان کو استعمال کیا جو لوگ بولتے تھے اور جس کی لغت غیر فہم نہ تھی۔ ایسے مواد کے ساتھ شاہ عبدالقادر نے اردو نثر کو جو اعتماد اور یقین مہیا کیا وہ ہر لحاظ سے قابل تعریف ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ سلاست اور بے ساختگی کی جو روایت اس ترجمے کے ذریعے قائم ہوئی تھی اسے مناسب شہرت نہیں دی گئی۔ اور اردو زبان کی ان صلاحیتوں کو استعمال نہیں کیا گیا جو شاہ عبدالقادر کے ترجمے کے ذریعے ظاہر ہوتی ہیں۔

—

مجھے بخوبی احساس ہے کہ میرا موضوع ترجمے کی ضرورت ہے۔ اور میں نے "ضرورت" کی تائید میں بہت سی ایسی باتیں کہی ہیں۔ جو سرسری طور پر ترجمے کی ضرورت پر غالباً بہت کم روشنی ڈالتی ہیں۔ لیکن کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ ترجمے کی ضرورت علم اور زبان کی افزائش سے تعلق رکھتی ہے۔ اور ہم نہ صرف زبان کی وسعت چاہتے ہیں بلکہ ذہن کی وسعت بھی ہمارے سامنے ہوتی ہے۔ جب ہم ترجمے کا ذکر کرتے ہیں۔ ترجمہ اصل میں دو زبانوں اور دو تہذیبوں کے مابین پل کا کام دیتا ہے۔ جس کے ذریعے خیالات اور تصورات ایک تہذیب سے دوسری کی طرف، اور ایک

ملک سے دوسرے ملک کی جانب جاتے ہیں. اور اس سارے عمل میں درآمد اور برآمد دونوں کیفیتیں شامل ہوتی ہیں. ایک طرف کے تصورات دوسری طرف اور دوسری طرف کے اس جانب آتے ہیں. لیکن میرا مضمون برآمد کی کیفیت کو اپنی فہرست میں شامل نہیں کرتا۔ اگر ایسی بات ہوتی تو میں پروفیسر آربری، وکٹر کیرنین، اور صوفی اے. کیو. نیاز کا ذکر کرتا۔ ترجمے کی ضرورت ہمارے قومی مقاصد کے تابع ہے. اور درآمد کے اصولوں کو پورا کرتی ہے. جس طرح ہم دساورے مشینیں منگواتے ہیں تاکہ کارخانے قائم کریں اور اس طرح ملک کے معیار زندگی کو بلند کریں. اس طرح دساورے کتابیں منگوا کر اس ملک میں تصورات اور سائنسی تعلیم کو علمی فضا کا حصہ بنانا چاہتے ہیں تاکہ دنیا کی تہذیب کا تندرست اور قیمتی سرمایہ ہماری زبان میں شامل ہو کر ہماری تعلیم کا حصہ بن جائے اور ہم اپنی سوچ بچار کے علاقے وسیع سے وسیع تر کر سکیں۔

لیکن ایسی ضرورت سراسر افادی ہے. ترجمے کی ضرورت تہذیبی نشوونما کے لیے بھی لازمی ہے. کیوں کہ تہذیبیں ایک عرصے کے بعد اپنے سرچشموں کو خشک کر دیتی ہیں. اور اپنے آپ میں سے پھر کوئی نئی شے پیدا نہیں کر سکتیں. اس طرح وہ ذہنی علاحدگی اور یک طرفہ تہذیبی تعصب کا شکار ہو جاتی ہیں. اس بیماری کو ترجمے کا عمل دور کرتا ہے. اور قومیں اور تہذیبیں، مسافت اور جغرافیے کی دقتوں کے باوجود ایک دوسرے سے آشنا ہوتی ہیں. اور انسانوں کے گروہ مختلف دوسرے گروہوں کو پہچاننے لگتے ہیں. اور انسانی برادری کا چہرہ نظر آنے لگتا ہے جس کی جانب انسان ہمیشہ سے سفر کر رہا ہے. کئی ایک دوسری سرگرمیوں کی طرح ترجمے کا عمل بھی انسان کو انسان کے قریب تو لاتا ہے. اور ذہن کی سرحدیں پھیلاتے ہوتے کہتا ہے. زبانیں مختلف سہی، ملک دور دور سہی، مگر انسان ایک غیر منقسم صداقت ہے۔

ڈاکٹر ظ۔ انصاری

ترجمے کے بنیادی مسائل

[یہ مقالہ ادب لطیف لاہور، اگست ۱۹۵۳ء سے نقل کیا گیا ہے]

ترجمے دنیا کی تمام زبانوں میں ہوئے ہیں. جو لکھی اور بولی جاتی ہیں. مگر کسی قابل ذکر مصنف نے کوئی واضح کتاب یا ایسی مفصل تصنیف یا تالیف نہیں چھوڑی جو ترجمے کے بنیادی مسائل کو، ساری دشواریوں اور سہولتوں کو سامنے رکھ کر ان کا حل بتا سکے۔ جس سے ترجمہ کرنے والے کو آگے چل کر اپنی ڈگر صاف نظر آئے اپنی حدود اور اپنی ذمہ داریوں کا علم ہو اور جسے وہ اپنی تربیت کے لیے استعمال کر سکیں۔

زیادہ حیرت اس وقت ہوتی ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ لغت، صرف و نحو، معانی و بیان اور اصطلاحات پر ہر زمانے میں کافی توجہ کی گئی۔ اور لسانیات کے ایک سے ایک لائق صاحب قلم نے الفاظ و لغات کو ایک ایک پہلو سے پرکھا۔ انھیں زیادہ مکمل اور مفید بنانے کی کوشش کی مگر ترجموں پر صرف رائے زنی کر کے سوالوں اور اصولوں کو ترجمہ کرنے والے کے ضمیر اور اس کی صلاحیت پر چھوڑ دیا۔ جو لوگ زبانوں اور ادبوں پر حاوی تھے وہ بھی محض اپنی کاوشوں کو نشان راہ کے طور پر چھوڑ کر چلے گئے۔ ڈاکٹر کیمبل اور الگزنڈر ٹٹلر جنھوں نے اس مسئلے پر انیسویں صدی کے وسط میں دو اہم مضمون لکھے ہیں ان کا بیان ہے کہ لاطینی، عبرانی، یونانی، فرانسیسی اور انگریزی جیسی وسیع اور دولت مند زبانوں میں بھی اس موضوع پر کوئی کتاب یا مستقل تصنیف نظر نہیں آتی۔

ترجمے کے مسائل پر کوئی بنیادی اصول وضع نہ کرنے کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ خود انگریزی اور فرانسیسی زبانوں کے مانے ہوئے مترجم ڈرائڈن کے بیان کے مطابق بہت کم ترجمے ہیں. جو قابل برداشت ہیں کیوں کہ ترجمہ کرنے کے لیے جس درجے کی ذہانت، سنجیدگی، علم اور مشق کی

ضرورت ہے وہ بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ اور ترجمہ کرنے کے معاملے میں ہر شخص بے لگام ہے۔ جیسا اور جس کے جی میں آتا ہے ترجمہ کر ڈالتا ہے۔

ترجموں کی اہمیت

نئی زبانیں قدیم زبانوں کی انگلی تھام کر چلنا سیکھتی ہیں، اور قدیم و جدید زبانیں اپنی ہم عصر زیادہ دولت مند زبانوں کا سہارا لیتی ہیں یہ عمل تاریخ تمدن کے ایک باب کی طرح ہمیشہ سے جاری ہے اور ترجمہ ہمارا سب سے اہم ذریعہ ہے جس کی بدولت یہ عمل آج تک جاری ہے چراغ سے چراغ جلتا ہے اور کڑی سے کڑی ملتی جاتی ہے۔

ترجمے ہی کے ذریعے ایک مخصوص ملک، ایک جغرافیائی علاقے اور ایک خاص قوم کی تحقیقات، اس کے علوم و فنون تمام انسانیت کی ملکیت بنتے ہیں اس لحاظ سے ترجمہ کی ذمہ داری کم از کم اتنی اہم ہے جتنی کسی کیمیاوی یا معدنی قوت کو ایک روپ سے دوسرے روپ میں ڈھالنے کی ہوتی ہے۔ تیل، کوئلے اور سونے کی کانیں جب تک زمین کے سینے میں دبی رہیں اس وقت تک وہ قومی دولت نہیں سمجھی جاتیں لیکن جب اس ذخیرے کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جانے لگے، تو یہی عمل دولت کی پیداوار سمجھا جاتا ہے اور یہ دولت تمام عالم انسانی کی مجموعی دولت میں اضافہ کر دیتی ہے۔

سقراط، "وی مقراطیس" اور افلاطون کی دو ہزار سال سے زیادہ پرانی کاوشیں روما اور یونان کے قدیم کھنڈروں میں دب دبا کر رہ گئی تھیں۔ اگر عربی زبان کے ذی علم مترجم انھیں وہاں سے نکال کر یورپ اور ایشیا کی آخری سرحدوں تک کھلی ہوا میں نہ لے گئے ہوتے بو علی سینا، ابن رشد، ابو نصر فارابی کے کارنامے یروشلم، غرناطہ اور بغداد کے محاصرے میں دم توڑ چکے ہوتے اگر بعد کی لاطینی زبانوں نے انھیں اپنے یہاں منتقل کر کے تاریخ و فلسفہ کے اگلے ورق کے لیے محفوظ نہ کر لیا ہوتا۔

ترجمہ بجائے خود ایک مستقل فن ہے اور اس علم یا فن میں اضافہ بھی ہے جس کی تصنیف کا ترجمہ کیا جائے۔ لیکن اسی کے ساتھ ترجمے کی بدولت اور اس کی خاطر اکثر اضافے کیے گئے ہیں

ہر زبان میں ترجموں کے ذریعے نئے الفاظ و اصطلاحات محاوروں اور کہاوتوں کا اضافہ کرنا پڑتا ہے۔ جو اول اول لھرے معلوم ہوتے ہیں، رفتہ رفتہ زبانوں پر رواں ہونے لگتے ہیں کہیں اصل تصنیف کے الفاظ و عبارت کو، اس کے خاص لہجے کو ترجمے میں برقرار رکھنے کی کوشش میں یہ اضافہ خود بخود ہو جاتا ہے اور اسی طرح ترجمے کی راہ سے اس زبان کی لغت اور طرز ادا میں نئے شگوفے پھوٹتے ہیں، نئے استعارے نمودار ہو جاتے ہیں جس زبان میں ترجمہ کیا گیا ہے۔

ترجمے کے ذریعے علم انسانی میں اضافہ کرنے والوں کا قافلہ بڑا شاندار ہے اور بہت طویل ہے اس میں بڑے بڑے حلقے ہیں۔ اگلے سرے پر بو علی سینا، درمیان میں والٹیر موجود ہیں تو پچھلے سرے پر ڈاکٹر ذاکر حسین اور پسترناک، عرب و عجم کے علما نے یونانی، ہندوستانی فلسفہ، طب، ہیئت و نجوم اور داستانوں کا عربی میں ترجمہ کر کے ان پر اپنی معلومات کے حاشیے بڑھا کر علمی دنیا سے خراج پایا۔ لاطینی و رومی کے ذریعے مشرق کو اور سنسکرت کے تراجم کے ذریعے مغرب کو اپنے زمانے تک کی تحقیقات سے باخبر کر دیا۔ پھر زمانے نے کروٹ لی۔ — والٹیر نے شیکسپیر کا ترجمہ کر کے فرانسیسی زبان کے ذخیرے میں اور پسترناک نے روسی زبان کے ادب میں بیش بہا اضافے کیے، خود اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ علمائے مستشرقین نے مشرق کے کلاسیکی ادب اور علمی کتابوں کو مغرب سے روشناس کرایا۔ اس دوطرفہ عمل نے مشرق و مغرب کی طنابیں کھینچ دیں۔ باہمی خیر خبر کی گنگا دونوں سمتوں میں بہنے لگی۔

ترجمے کی اس اہمیت کو ہر زمانے میں تسلیم کیا گیا ہے۔ جاگیرداری حکومتوں کے طویل زمانے میں ہم جا بجا دیکھتے ہیں کہ دوسری زبانوں سے مختلف علوم و فنون کے ترجمے کرانے کے لیے بڑے پیمانے پر انتظامات کیے جاتے تھے چن چن کر علوم و فنون اور زبانوں کے علما بلائے جاتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ ترجموں کی اشاعت کا سرکاری سطح پر انتظام کیا جاتا تھا ترجموں کے کمیاب مخطوطے شاہانہ تحفوں اور ہدیوں میں بھیجے جاتے تھے۔ اشوک اعظم کے پاٹلی پترا میں، بنی عباس کے بغداد میں، بنو فاطمہ کے قاہرہ اور سکندریہ میں، عہد اکبری کے آگرہ میں اور بالآخر نظام کے حیدرآباد میں دارالترجمہ ملتے ہیں پھر ان مقامات سے جو ترجمے

نکلے ان کا اثر خود ان زبانوں کی ساخت پر پڑا۔ جن میں وہ ترجمے کیے گئے تھے۔ نہایت قریبی مثال کے لیے یہ کہنا کافی ہے کہ فورٹ ولیم کالج کے ترجموں کے ذریعے دور دراز کی زبانوں نے ایک دوسرے سے مل کر سنگم بنائے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے دھاروں کے پاٹ چوڑے کیے ہیں اور ان سے زیادہ گہرائی اور روانی پیدا کی ہے۔

اردو تو ایک باقاعدہ زبان بنی ہی ترجموں کی بدولت، ورنہ جب تک وہ کھڑی بولی کے روپ میں تھی اسے کسی بڑے قلمکار نے ادبی تصنیف کے قابل نہ سمجھا۔ بولی سے زبان تک کا طویل فاصلہ ایک صدی کے اندر طے کر لینے میں ترجموں کا بڑا ہاتھ ہے۔ کہیں یہ ترجمے کتابی صورت میں ہوئے اور کہیں محض خیال، استعارے اور اصطلاحوں کی صورت میں۔ تاریخ دہرانے کی یہاں گنجائش نہیں۔ بہرحال یہ مسلّمہ ہے کہ عربی، فارسی، سنسکرت اور انگریزی کے علاوہ بھاشاؤں کے ترجمے اور ترجمانی کو اردو زبان کی تعمیر اور تربیت میں بڑا دخل ہے۔

لیکن چونکہ ہماری زبان کو منظم علمی و لسانی کام کا ایک پرسکون زمانہ نصیب نہیں ہوا اور با اقتدار طبقے کی سرپرستی میں پروان چڑھنے کی عمر طبیعی اسے نہیں ملی۔ اس لیے ترجموں میں خاص طور سے غیر ذمہ داری برتی گئی ہے، کہیں کہیں غیر زبانوں کا دخل، دخل بے جا بھی ہو گیا ہے۔ اور ایسے ترجمے ہوئے ہیں جو زبان کو عوام سے قریب لانے کی بجائے اسے اور دور لے جاتے ہیں، ترجموں کو ناقابلِ فہم بنا دیتے ہیں۔

احتساب بڑی اہم چیز ہے۔ خاص طور سے زبان و ادب کے معاملے میں۔ کیوں کہ وہ وہ میدان ہے جہاں بے اعتدالی کرنے پر کوئی قانونی گرفت نہیں ہوتی۔ ادب کے لیے سو طریقے احتساب کے مقرر ہیں۔ علم معانی، علم بیان، عروض یہ سب پیمانے ہیں اور ان پیمانوں سے ناپ ناپ کر نثر و نظم کو دیکھا جاتا ہے۔ پھر تنقید کے ذریعے احتساب ہوتا ہے اور اس کے بعد خود تنقیدی اصول ہیں جو تنقید کا بھی احتساب کرتے ہیں۔ لیکن ترجمہ اگر کامیاب ہو تو بجائے خود تخلیقی ادب کا حصہ بن جاتا ہے۔ اس کے احتساب کا کوئی اصول وضع نہیں کیا گیا۔ اور نہ ایسے پیمانے بنا کر ترجمہ کرنے والوں کے سامنے رکھے گئے

جو احتساب کے کام آ سکیں۔

یہی وجہ ہے کہ دوسری زبانوں سے قطع نظر خاص طور سے ہماری زبان میں ایسے ترجموں کی کوئی کمی نہیں۔ جو زبان و ادب میں اضافہ کرنے کے بجائے اسے اور نقصان پہنچاتے ہیں۔ لب و لہجہ پر برا اثر ڈالتے ہیں، اصل تصنیف کی طرف رغبت پیدا کرنے کے بجائے اس سے نفرت دلاتے ہیں اور اردو کے مزاج کو راس نہیں آتے۔

زبان کا مزاج

ہر زبان کا ایک مزاج ہوتا ہے۔ یہ مزاج پا لینا ترجموں کے معاملے میں بہت اہم چیز ہے یہاں میں اس تفصیل میں نہیں پڑوں گا کہ یہ مزاج کیوں کر بنتا ہے لیکن مزاج کے لفظ سے غلط فہمی دور کرنے کے لیے اتنا کافی ہے کہ زبان تقریباً ویسی ہی حقیقت ہے جیسے کسی قبیلے یا کسی خاص قوم کا مزاج (جسے ذرا بدل کر قومی تہذیبی روایت بھی کہتے ہیں)، یہ مزاج تاریخی، جغرافیائی، سماجی اور معاشی اخلاط سے بنتا ہے۔ اور کسی ایک خلط کی کمی بیشی اسی مزاج پر اثر انداز ہوتی ہے۔

پھر جس طرح ایک قوم کے مشترکہ مزاج کے اندر رہتے ہوئے کوئی خاندان یا فرد اپنا الگ مزاج بھی رکھتا ہے۔ اسی طرح ہر زبان کے اندر الگ الگ زبانیں بھی ہوتی ہیں۔ مشترکہ زبان پورے ایک سماج کی ہوتی ہے اور تاریخ کے ایک دور کی ہوتی ہے لیکن اسی ایک مشترکہ قومی زبان کے اندر الگ الگ لہجے ہوتے ہیں۔ الگ الگ موضوعات کے جداگانہ حلقوں یا گروہوں کے لہجے، خطوں کی بولیاں طبقوں یا ایک ہی طبقے کی جداگانہ پرتوں کے رہن سہن اور حالات زندگی کے مطابق ان کی اپنی اصطلاحیں اور محاورے قبیلوں اور فرقوں کی تاریخی روایات کے مطابق تلمیحیں، تشبیہیں اور استعارے اور پھر ان سب کے بعد ایک مخصوص سماجی دور کی اصطلاحیں، ان سے ایک زبان کے اندر کئی زبانیں پیدا ہوتی ہیں اور اس وقت تک قائم رہتی ہیں جب

تک سماج متفرق[1] رہتا ہے۔

زبان کے مزاج کو اور زیادہ واضح کرنے کے لیے دو مثالیں کافی ہوں گی۔

فارسی زبان ایک ایشیائی زبان ہے جس کا تعلق آریائی زبانوں کے خاندان سے ہے۔ پہلوی زبان کے قدیم ترین جاگیرداری عہد کی اعلیٰ تہذیب کے بنیادی عناصر اس میں شامل ہوئے۔ بعد میں کیانی خاندان کی زبردست ایشیائی سلطنت کے شان و شکوہ نے نفوذ کیا۔ اور اپنی عظمت اور خوش حالی کے نشان چھوڑے مرکزی ایران کی زرخیز وادی کی آب و ہوا نے اسے لوچ بخشا۔ عربوں کے غلبے نے اس میں عربی الفاظ و اصطلاحات کی کثرت اور سطوت پیدا کی۔ منگول، تاتار حملوں نے اور بعد میں طوائف الملوکی نے اس میں سوز و گداز کی کیفیت اور انفعالی اثرات پیدا کیے۔ قاچاری عہد میں انگریزی اور فرانسیسی تہذیب کے اثرات داخل ہوئے۔ اور اب قومی آزادی کا عام شعور اور جمہوری تحریک اسے اپنے رخ پر ڈھال رہی ہے۔

فارسی زبان و ادب کو پچھلے ڈھائی ہزار برس میں کئی قوموں سے سابقہ پڑا ہے اور کئی زبانوں کے اثرات اس پر حاوی یا منتشر ہوتے رہے ہیں لیکن ان میں پائدار اثرات وہی نکلے اور وہی زیادہ سے زیادہ مقبول رہے جو اس زبان کے مزاج کو راس آئے اور جو اوپر سے تھوپے گئے تھے بیرونی دباؤ ہٹ جانے کے بعد وہ اثرات بھی زائل ہو گئے آج عربی زبان کی ان مشکل اصطلاحوں کا گذر فارسی میں نہیں ہے۔

جن کے لیے خود فارسی زبان کے الفاظ پہلے سے موجود تھے یا آسانی سے زبان پر رواں ہو سکتے تھے۔ البتہ کوشش کے باوجود ان عربی لفظوں اور اصطلاحوں کو زبان سے

---

[1] "متفرق" کا لفظ یہاں تشریح طلب ہے۔ محنت اور دولت کی تقسیم سے اس کا تعلق ہے۔ جہاں، جس سماج میں جس قدر ہمواری بڑھتی جائے گی۔ تفریق کم ہوتی جائے گی۔ مثال کے طور پر مرداند اور زنانہ انتخاب الفاظ اس سماج میں روز بروز گھٹتا جاتا ہے۔ جس سماج میں مرد و زن صنعت و حرفت میں دوش بدوش کام کرتے رہیں۔ ظ۔ا۔

خارج نہیں کیا جا سکا جنھیں فارسی نے اپنا جزو بدن بنا لیا تھا۔

اسی اعتبار سے ایران پر فرانس کے مقابلے میں برطانیہ اور روس کا زیادہ اثر رہا لیکن دو سو برس برطانوی اثر کے باوجود فارسی زبان کا مزاج انگریزی کو اتنا قبول نہیں کر سکا جتنا اس نے فرانسیسی کو قبول کیا۔ جس طرح حروف تہجی اور آوازوں کی ادائیگی میں اپنی بہن سنسکرت کے ٹ۔ ڈ اور ڑ کو قبول نہ کر سکی۔ اسی طرح اس نے انگریزی کی اصطلاحوں، محاوروں اور الفاظ کے مقابلے میں فرانسیسی کو زیادہ قریب پایا۔ اور اس کو اپنے اندر کھپایا ایک حرف "ژ" کا نہیں بلکہ مزاجی ہم آہنگی کا نتیجہ ہے کہ جدید ترین فارسی میں نہیں فرانسیسی بلکہ روسی کے بھی درجنوں الفاظ ملتے ہیں اور فارسی زبان و ادب کا مغربی ادب سے جو رشتہ قائم ہوا ہے وہ فرانسیسی کے ذریعے سے ہوا ہے۔

اب جو لوگ فارسی میں انگریزی، روسی یا اردو زبان سے ترجمہ کرنا چاہیں، انھیں صرف لغت کا نہیں بلکہ فارسی زبان کی پچھلی تاریخ کا، اس کے ارتقا کا اور اس کے مزاج کا بھی پورا احساس ہونا چاہیے تاکہ ان کا ترجمہ فارسی زبان و ادب کو کچھ دے سکے اور اس کا جزو بدن بن سکے۔

مصری اخبارات بلکہ ناولوں تک میں اس قسم کے محاورے ملنے لگے ہیں ——— "لعب دوراً خطيراً"[1] ——— یہ محاورہ عربی زبان کے لیے بالکل اجنبی معلوم ہوتا ہے تحقیق کرنے سے پتہ چلا کہ یہ محاورہ صرف لکھا جاتا ہے، بولا نہیں جاتا۔ کم از کم گفتگو کی سلیس زبان میں اس کا رواج نہیں۔ انگریزی سے جو ترجمے عربی میں ہوئے ان میں ترجمہ کرنے والوں نے یہ پوری ترکیب یونہی اٹھا کر رکھ لی۔ اب ترجموں میں یہ جملہ کی قوت لکھ دی جاتی ہے لیکن عربی زبان کے مزاج میں حل نہیں ہوئی اور نہ ہو سکتی ہے کیونکہ عربی زبان

---

[1] عربی میں یہ بالکل ایسا ہے جیسے ہم اپنی زبان میں کہیں "وہ ایک بڑے گھیرے سے کھیلا" جو ترجمہ ہے انگریزی کے He played great role کا۔ اور مفہوم اس کا یہ ہے کہ اس نے زبردست خدمات انجام دیں۔

یہی مفہوم ادا کرنے کے لیے دوسری گنجائشیں موجود ہیں۔ ان گنجائشوں سے کام لیا جاتا تو انگریزی محاورے کا یہ مفہوم عربی زبان میں اضافہ کرتا اور اسی کا ایک حصہ بن جاتا لیکن اب یہ محض کورانہ تقلید کا ایک نمونہ یا حصہ ہے اور بیان کے بھدّے پن میں اضافہ کرتا ہے۔

یہ ایسی بات ہے جیسے ہمارے ترجمہ کرنے والے عموماً

It is going to be

کو لکھتے ہیں "یہ ہونے جا رہا ہے" حالاں کہ اردو کی عام گفتگو میں اس کے لیے "یہ ہونے والا ہے" موجود ہے۔ کسی شعر میں "ہونے والا ہے" کی جگہ "ہونے جا رہا ہے" رکھ کر دیکھا جائے۔ یا مثلاً "وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے" کو "مصیبت آنے جا رہی ہے" لکھیے تو معلوم ہوگا کہ منہ کا مزا خراب ہو گیا۔ یوں اگر دیکھیے تو "ہونے جا رہا ہے" کا مفہوم سوائے اس کے کچھ نہیں جو "ہونے والا ہے" کا مفہوم ہے لیکن "ہونے والا" دراصل ہماری زبان کے مزاج کو راس آچکا ہے اور اس کا ایک حصہ ہے۔ یہی حال "میں دلچسپی لینے" اور "میں یقین رکھنے" کا ہے جو لفظی ترجمہ ہے

Taking interest.

in اور Have faith in کا۔ حالاں کہ ہمارے ہاں پہلے سے موجود تھا۔ "سے دلچسپی ہونا" "پر ایمان لانا" "پر یقین کرنا" اور یہی بہتر بھی ہے۔

یہ محض ایک لفظ کی تبدیلی کا حال ہے۔ پورے پورے جملوں کی ساخت اور اصطلاحوں کے استعمال میں زبان کے مزاج کا اور زیادہ خیال رکھنا پڑتا ہے ورنہ وہ اوپری معلوم ہوتے ہیں اور کسی طرح کھپتے نہیں۔

ایک زبان میں کئی کئی زبانیں

یہیں وہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ ایک زبان کے اندر کئی زبانیں ہوتی ہیں، اور یہ زبانیں صرف طبقوں یا فرقوں یا ملتوں یا قبیلوں کے علیحدہ علیحدہ ہونے پر منحصر نہیں بلکہ ایک ایک فرد کے کردار اور ماحول کے مطابق ان میں اختلاف ہو سکتا ہے ایک ہی طبقے یا ایک ہی قومیت کے مختلف افراد ایک جگہ بیٹھے ہیں۔ ایک شخص چودھری یا صاحب اثر ہے اور دوسرا ایک

عام آدمی۔ تیسرا وہ شخص جس کی بات بات میں مزاح اور چاشنی ہے، چلبلا پن ہے۔ چوتھا عالم فاضل قسم کی طبیعت رکھتا ہے۔ اور پانچواں خانہ زاد ملازم ہے۔ کسی ناول میں ان کی ضیافت کا تذکرہ آجاتا ہے۔ وہ سب اپنی اپنی بات کہتے ہیں۔ اور ان کا ترجمہ کرنا مقصود ہے تو ظاہر ہے کہ صاحبِ نظر ادیب یا مصنف نے اپنی زبان میں وہاں جو جملے ان پانچوں کی زبان سے ادا کیے ہوں گے۔ وہ پانچ الگ الگ جھلکیاں رکھتے ہوں گے۔ ہو سکتا ہے کہ بظاہر ان پانچ قسم کی گفتگوؤں کے الفاظ میں نمایاں فرق نہ ہو، ان الفاظ کا پس منظر ان کے الفاظ کا لہجہ، ان کی ادائیگی اور تلفظ اور پھر جملوں کی ساخت ایسی ہوگی جو ہلکے سے اشارے میں ہر ایک فرد کے اپنے مزاج اور اپنی سماجی حیثیت کا پتہ دے گی۔ یوں نہ ہو تو ترجمے میں اصل کی تصویر دھندلا جائے۔

اگر ترجمہ کرنے والا ایک زبان کے اندر کئی زبانوں کے راز سے ناواقف ہے تو وہ لفظ بہ لفظ لغوی ترجمہ کرتا چلا جائے گا۔ اور وہ جو مفہوم اور اشارے ان الفاظ کی پشت سے جھانک رہے ہیں ترجمے میں غائب ہو جائیں گے۔ اردو کے اکثر ترجمے میں نے ایسے دیکھے ہیں جن میں یہ نقص ناقابلِ برداشت حد تک پایا جاتا ہے۔ نام لینا ضروری نہیں لیکن جن لوگوں نے ناولوں کے قلم برداشتہ اور سب سے زیادہ ترجمے کیے ہیں ان کے یہاں یہ خامی خصوصیت سے پائی جاتی ہے۔ اور ترجمے کے وقار کو گرا دیتی ہے۔

زبان کے اندر زبان کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ زبان ایک ہی ہے لیکن مختلف پیشوں طبقوں اور مختلف زبانوں میں الفاظ و محاورات کا استعمال اور ان کی ادائیگی بدلتی رہتی ہے بائیبل (انجیل) کے کئی مستند انگریزی ترجمے ہوئے ہیں اور یہ ترجمے لاطینی، یونانی، عبرانی اور انگریزی کے بڑے بڑے ماہرین نے مل کر کیے ہیں۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ آسان انگریزی استعمال کرنے کے باوجود ان میں خاص خیال اس بات کا رکھا گیا ہے کہ کلامِ ربانی کی شان باقی رہے اور آج تک برابر اسی کی پابندی ہو رہی ہے۔ پروٹسٹنٹ تحریک جو بائیبل کو علاقائی یا رائج دیسی زبان میں منتقل کرنے پر کفر کے فتووں کا سامنا کر رہی تھی اس نے بھی بائیبل کا ترجمہ کرتے وقت اس نکتے کو ملحوظ رکھا اور اسی کا نتیجہ ہے کہ جب عام انگریزی میں کسی

کیریکٹر کی زبان سے ایسا جملہ ادا کرنا ہوتا ہے جس میں کلام ربانی کی سی شان ہو تو اسے انجیل کے انداز بیان سے ملا دیا جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص اس طرح حتمی یا آخری بات کرتا ہے گویا وہ ہر راز سے ہر معاملے سے اتنا واقف ہے کہ اس سے زیادہ باخبر ہونا ممکن نہیں۔ یا کوئی شخص اپنی گفتگو اور اپنے احکام میں مذہبی تقدس کی چاشنی یا اس کا سا رنگ ابھارنا چاہتا ہے تو اس کی زبان سے ایسے جملے لکھے جاتے ہیں، جو سادہ انگریزی میں ہونے کے باوجود اپنے گرد تقدس کا ہالہ رکھتے ہیں، اور انجیل کے جملوں، استعاروں، کہاوتوں اور ہدایتوں سے مشابہت پیدا کر لیتے ہیں۔ اب اگر کوئی شخص انگریزی سے ان کا ترجمہ کرے تو اسے یہ بات پیش نظر رکھنی ہوگی کہ کہاں سے اصل عبارت کا انداز انجیل کی زبان سے مشابہت رکھتا ہے اور جہاں سے جملوں میں یہ صورت پیدا ہوئی ہے۔ وہیں سے ترجمے کی عبارت میں بھی تبدیلی کرنی ہوگی۔ اور جس زبان میں ترجمہ کیا جا رہا ہے اسی زبان میں بھی اسی لب و لہجے کے مقدس پرشکوہ پُرتکلف الفاظ و محاورات تلاش کرنے ہوں گے۔ جن سے کلام ربانی کی جھلک ملے۔ مثلاً ایک شخص جو نبی ہے وہ کسی کا ہاتھ دیکھ رہا ہے اور اپنے معمول کو بتاتا ہے کہ یا تو تم فلاں فلاں پر ایمان لاؤ ورنہ Or less ye forever be condemned اب اگر ایمان کی بجائے انگریزی لفظ Confidence کا ترجمہ یقین بھروسہ یا اعتماد لکھ دیا گیا اور اس کے بعد والے جملے کا ترجمہ سیدھا سادہ کر دیا گیا کہ "ورنہ تم ہمیشہ مصیبت میں رہو گے" یا "ہمیشہ تم دھتکارے جاؤ گے" تو اصل عبارت کی غرض اور فضا غارت ہو جائے گی۔ کیوں کہ انگریزی کا جملہ خاص انجیل کی عبارت کا حصہ ہے۔ اور اسے ترجمے میں ایسے آنا چاہیے جیسے کوئی مقدس برگزیدہ ہستی ارشاد فرما رہی ہے اور ربانی احکام پہنچا رہی ہے۔ اس جملے کا بہتر ترجمہ یہ ہوگا: "ورنہ ابد تک معتوب رہو گے"

اسی طرح زبان کے اندر کئی زبانیں ہوتی ہیں۔ مثلاً ایک زبان جدید ہے ایک قدیم ہے اور دونوں ایک ہی زبان کا حصہ ہیں۔ فرق صرف زمانے کا ہوتا ہے۔ میر انیس کی زبان آج بھی سند مانی جاتی ہے۔ لیکن وہ گفتگو میں جو زبان بولتے ہوں گے اور آج کی گفتگو کی زبان میں فرق نہ کرنا زیادتی ہوگی۔ مثلاً وہ اپنے یہاں مجلس میں آنے والوں کی تواضع کرتے

ہوئے کہا کرتے تھے "صاحبو، جاگہ ادھر ہے"۔ اب اگر اس زمانے کے شرفائے لکھنؤ کے جیسے کسی کردار کی گفتگو کا ترجمہ کرنا ہو "ہمیں حضرات ادھر تشریف رکھیے" نہیں بلکہ وہی لکھنا چاہیے "صاحبو جاگہ ادھر ہے" تبھی ترجمے میں اصل عبارت کی چاشنی پڑے گی۔ قدیم وضع کے کرداروں کی زبان میں اور جدید انداز کی بات چیت اور گفتگو میں جو فرق ہمارے یہاں ہے۔ ترجمے میں بھی اس کا لحاظ رکھنا پڑے گا۔ ایک زبان کے اندر کئی زبانوں کی تیسری صورت یہ ہے کہ بود و باش اور معاشی حالات کا بھی زبان سے گہرا تعلق ہے۔ ایک شخص جس کا پیشہ کاشتکاری ہے چوپال میں تقریر کرنے کھڑا ہوگا تو چاہے اس کا موضوع بھی گرام سدھار سے متعلق کیوں نہ ہو لیکن اس کی زبان میں اور شہر سے آئے ہوئے گرام سدھار افسر کی زبان میں فرق ضرور ہوگا۔ دونوں کی اگر اصطلاحیں بھی ایک مان لی جائیں۔ تب بھی جملوں کی ساخت میں پیچیدگی کے سبب انتر پڑے گا۔ ترجمے میں ان الگ دھاریوں کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔ اول تو اصل عبارت ہی اس فرق کو ظاہر کر دے گی۔ تاہم ممکن ہے یہ فرق بظاہر نہیں بلکہ زیادہ غور کرنے سے ہاتھ آئے تو ایسے موقعوں پر زیادہ غور کرنے اور دونوں کی تقریر کو الگ الگ الفاظ اور جملوں سے واضح کرنے کی ضرورت پیش آئے گی۔ کچھ لوگ آسانی اور اختصار کے خیال سے یا بے پروائی سے اسی فرق کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ گرام سدھار کا افسر تقریر کرنے کھڑا ہوتا ہے وہ بھی انھیں مسائل کو چھیڑتا ہے۔ زبان کی قواعد اور الفاظ کی صحیح ادائیگی کا اتنا ہی خیال رکھتا ہے اور ایک عام کھیت مزدور یا نیم خواندہ کسان بھی انھی الفاظ عبارتوں اور جملوں کو بے تکلفی سے ادا کرتا ہے۔ اگر ایسا کیا گیا تو ترجمے میں مصنوعی پن (یہ لفظ میں نے تصنع کی جگہ لکھا ہے۔) پیدا ہو جائے گا۔ کیونکہ اصل زندگی میں ایسا نہیں ہوا کرتا۔

مثال لیتے ہیں: ایک معمولی کسان اجنبی شکاری کو اپنا مہمان بناتا ہے اور اس سے کہتا ہے: "تشریف لے چلیے۔ نانِ شبینہ تناول فرمایئے۔" تو یہ اصل عبارت come in, have your dinner کا صحیح ترجمہ ہوتے ہوئے بھی غلط ہے، کیونکہ ایک زبان کے اندر کئی زبانیں ہیں۔ دیکھنا ہوگا کہ "ڈنر" کا لفظ ایک معمولی کسان کی زبان سے ادا ہوگا۔ تو اردو میں کیا ہوگا اور کسی پڑھے لکھے جاگیردار کی

زبان سے ادا ہو تو کیا ہو گا۔ رات کے کھانے کی طرف کسی کو متوجہ کرنے کے لیے کئی قسم کے جملے موجود ہیں۔ اور یہ کئی قسم کے لوگ الگ الگ بولتے ہیں۔ ہمارے یہاں کے غریب کھیت مزدور کے یہاں رات کا کھانا میز پر نہیں چنا جاتا۔ لیکن برطانیہ کے دیہاتی کاشتکار سے یہ توقع کی جا سکتی ہے اور ہمارے جاگیردار اور کھاتے پیتے زمیندار گھرانوں میں "دسترخوان چنا جا چکا ہے"، یا "تھال لگ گیا ہے" یا "ماحضر تیار ہے" یا "نان شبینہ حاضر ہے" ایسے جملے ہیں جو مختلف معاشرت کے لوگوں میں علاحدہ علاحدہ بولے جاتے ہیں۔ ان کئی زبانوں کا امتیاز سمجھنا اور انھیں حسبِ موقع ترجمے میں استعمال کرنا بے حد ضروری ہے ورنہ اصل کا سارا مزا کرکرا ہو جائے گا۔ ایسا ہی "کرکرا پن" وہاں پیدا ہوا ہے، جہاں روس کے شاعرِ اعظم "پوشکن" کے ایک مشہور افسانے کا عنوان انگریزی میں "اسٹیشن ماسٹر" دیا گیا۔ اور اردو میں جوں کا توں لے لیا گیا۔ روس میں وہ کردار اس چوکی کے غریب، تباہ حال اور بے بس منشی کی نمائندگی کرتا ہے جو ریلوں کا وسیع جال بچھنے سے پہلے کسی گاؤں یا کارواں سرائے کے ناکے پر بدلی کے گھوڑے مہیا کیا کرتا تھا۔ کوئی افسر اسے ڈانٹتا ہے۔ کوئی مالدار بیوپاری اسے ذلیل کرتا ہے۔ کسی کو اچھے گھوڑے درکار ہیں اور وہ مہیا نہیں کر سکتا۔ آخر ایک جوان افسر چالاکی سے اس کی بیٹی اغوا کر کے چل دیتا ہے۔ یہ آدمی شروع انیسویں صدی کے روس میں تو تھا، انگلستان میں نہیں تھا، وہاں اسٹیشن ماسٹر تھا۔ ریلوے اسٹیشن کا بڑا افسر، ہندوستان کا اسٹیشن ماسٹر تو اس سے بھی دو ہاتھ آگے خوشحال، بااثر اور افسرانہ شان کا آدمی ہوتا تھا۔ اب اگر "پوشکن" کے اس کردار کو ہم انگریزی کی تقلید میں اسٹیشن ماسٹر لکھ دیں تو افسانے کی روح فنا ہو جائے گی۔ وہ ہمارے یہاں ڈاک چوکی کا منشی ہے۔ اور یہی نام دیا جانا چاہیے تھا۔

یہاں ایک نقل کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہو گا۔

قرآن کا ترجمہ مختلف مفسرین نے کیا ہے۔ ان میں سب سے آسان اور روزمرہ کا ترجمہ ڈپٹی نذیر احمد مرحوم کا سمجھا جاتا ہے۔ موصوف شستہ اور بامحاورہ زبان لکھنے میں اپنی مثال آپ تھے۔ "امہات الامہ" لکھتے وقت بھی اسی صفت کو برت گئے اور بُرے پھنسے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے راتوں رات مکے سے باہر تشریف لے جانے کا تذکرہ یوں کیا کہ "وہ راتوں رات سٹک گئے"۔ "سٹک" کا لفظ اگرچہ عوام کی بول چال میں استعمال ہوتا ہے لیکن پیغمبر کی شان میں یہی لفظ ایک گستاخی سمجھا گیا۔ اور اسی طرح کے الفاظ کی بنا پر ڈپٹی نذیر احمد کے ترجمے کے خلاف عام جلسوں میں تجویزیں پاس ہوئیں اور بہت شور مچا۔

"سٹک گئے" یا "سرک گئے" یا "کھسک گئے" کی جگہ "نکل گئے" یا "باہر تشریف لے گئے" یا "چلے گئے" یا "روپوش" ہو گئے بھی استعمال ہو سکتا تھا۔ اور ان میں آخری لفظ اگرچہ اتنا عام فہم نہیں تھا پھر بھی اس شخصیت اور خاص حالات کے بارے میں یہی لفظ زیادہ مناسب رہتا۔

نقل اور آرٹ

ترجمہ بھی اسی طرح اصل کی ایک نقل ہے جیسے پہلے رقص یا مصوری یا اداکاری، پہلے میں بدن کے لوچ سے، مصوری میں مو قلم سے، اداکاری میں جسم اور آواز کی حرکات و سکنات سے اصل خیال کا ہو بہو ترجمہ کرنا پڑتا ہے اور ترجمے میں زبان دانی کی صلاحیت سے یہی کام لیا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت کی کوئی نقالی مکمل نہیں ہو سکتی، جب تک اس نقل کرنے والے کا جذبِ اندروں "شامل نہ ہو۔ وہ اداکاری بے روح ہو گی۔ جو اصل کردار کو اپنے اندر جذب کر کے اور خوب رچا کر پھر سے ایک نئے وجود کو جنم نہیں دیتی جس میں اصلیت اپنی تمام خصوصیتوں کے ساتھ ابھر کر سامنے آئے اور نقل کا یا نقل کرنے والے کا اپنا وجود نظروں سے اوجھل ہو جائے۔

عربی داستانوں میں ایک واقعہ نقل ہوا ہے کہ ایک شخص کی تصویر کو بے مثل قرار دیا گیا اور وہ تصویر شاہی دربار کے دروازے پر لٹکا دی گئی کہ اگر کسی کو اس کے بے مثل ہونے میں شبہ ہو تو وہ دلیل پیش کرے۔ تصویر یوں تھی کہ ایک انسانی ہاتھ میں انگور کا خوشہ ہے ___ کچھ انگور پکے ہیں کچھ کچے، تصویر کا آویزاں ہونا تھا کہ طوطوں اور چڑیوں نے اس پر ٹھونگیں مارنی شروع کر دیں۔ لوگوں نے اسے مصوری کا کمال جانا کہ جانور بھی دھوکا کھا گئے اور سچ مچ کا انگور سمجھے، لیکن ایک شخص دربار میں حاضر ہوا اور اس نے مصور کے کمال کو چیلنج کر دیا۔ اس

نے کہا کہ انگور کے خوشے تو واقعی انگور نظر آتے ہیں لیکن انسانی ہاتھ کی مصوری میں ضرور کوئی نقص رہ گیا ہے ورنہ چڑیوں کی مجال نہ ہوتی کہ وہ اس پر ٹھونگیں ماریں یعنی تصویر کے ایک حصے پر مصوّر کی توجہ اتنی زیادہ رہی کہ دوسرا حصہ نظر انداز ہوگیا۔ اور نقل اتارنے میں فرق آگیا۔ یہ دلیل مان لی گئی، اور تصویر اتار دی گئی۔

نقل وہی بے عیب اور اعلیٰ ہے۔ جو اصل کے ہر گوشے اور ہر پہلو کو من و عن نظر کے سامنے کردے۔ اور وہ بھی اس طرح کہ جو امکانات اصل میں موجود ہیں بظاہر نظر نہیں آتے وہ بھی نظر آنے لگیں۔

ترجمہ کرنے والے کو اصل کی نقل میں ایک مصنف اور اداکار کی طرح مصنف کے ساتھ ہلاک ہونا پڑتا ہے اس کے ساتھ تالیاں بجانا، قہقہے لگانا اور کراہنا پڑتا ہے۔ اور یہ سب کر لینے کے باوجود یوں سنبھل سنبھل کر قدم اٹھانا پڑتا ہے جیسے طوطا اودان پر چلتا ہے، تب جاکر ترجمہ ایک آرٹ بنتا ہے اور تخلیقی درجہ حاصل کرنے کے قریب پہنچتا ہے۔

مگر

دوسرے فنونِ لطیفہ میں اور اس ترجمے میں جو آرٹ اور تخلیق کا درجہ رکھتا ہے ایک بنیادی فرق بھی ہے۔

شاعری اور مصوری میں مبالغہ ایک حسن ہے۔ حقیقت کو لفظوں اور تصویروں میں اصل سے بڑھا چڑھا کر پیش کرنا اور جس پہلو پر دیکھنے یا سننے کی توجہ مرکوز کرنی ہے اسے خوب ابھار دینا یا اسے اصلیت سے بالکل مختلف شکل اس طرح رکھنا۔ ۔ ۔ کہ اصل تصویر یا اصل واقعے پر نظر جانے کی بجائے اس کے امکانات اس کے اثرات، اس کی تاثیر پر نظر جائے۔ یا ایسا باریک نقاب ڈال دینا کہ مخصوص گوشوں کی حقیقت بے نقاب ہو جائے۔ جو بات اصل کی محض نقل نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ آرٹ کی اس تخلیق میں حاصل ہو جاتی ہے کہ اس میں اصل کو اپنے اندر جذب کر کے ایک نئے وجود کو یا نئی تصویر یا واقع کو جنم دینا ہوتا ہے۔ جو اصل سے تعلق بھی رکھتا ہے ــــ اور بے تعلق بھی۔ فنی تخلیق کے اس مقصد کی خاطر ہر ایک فنکار کو اپنے اپنے میدان میں کافی آزادیاں ملی ہوئی ہیں۔ وہ "ناز و غمزہ" کی بجائے "دشنہ و خنجر" کہہ سکتا ہے

اور علم و دانش کے مفہوم کے لیے الو کی معصوم دو گول آنکھیں بنا سکتا ہے۔ ذرات کو آفتاب سے اور ممولے کو شاہین سے بھڑا سکتا ہے۔ لیکن ترجمہ کرنے والے کو اصل کی نقل اور اصل کے سارے امکانات پیش کرنے کے لیے یہ تمام آزادیاں میسر نہیں ہوتیں۔ وہ اپنی طرف سے نہ مبالغہ کر سکتا ہے نہ الفاظ کی رنگ آمیزی۔ اس کا فرض "مگج دار و مریز" میں ہے کہ دودھ اور پیالہ چھلکنے نہ پائے۔

یہ فرض ادا ہونے کے معنی ہیں کہ ترجمہ محض ایک بے روح نقالی نہیں رہ گیا بلکہ اصل کی ایسی نقل بن گیا۔ جو اصل کے سارے امکانات بے کم و بیش اپنے اندر رکھتی ہے۔ لیکن یہ ہو کیوں کر؟

اس کے لیے ضروری ہے کہ ترجمے میں اصل کا پورا خیال اور مفہوم، اسی لوچ یا نرمی اسی سختی یا درشتی۔ اسی جاذبیت یا دلکشی اور اسی بے کیفی یا بے رنگی کے ساتھ اسی احتیاط کے ساتھ آئے اور ویسا ہی معیار زبان و بیان کا بھی ہو۔

خیال و مفہوم اور اس کا جامہ

دراصل ترجمے کا بنیادی منشا ہی اصل کے خیال اور مفہوم کی ادائیگی ہے اور اسی منشا کو پورا کرنے کے لیے زبان اور بیان کا پورا پورا علم اور مکمل اندازہ ضروری ہوتا ہے۔

اس کی کم از کم تین شرطیں ہیں،

۱۔ جس زبان سے ترجمہ کیا جا رہا ہے اس زبان کی لغت سے، اصطلاحات اور محاوروں سے، کسی قدر ادبیات سے اور تھوڑی بہت تاریخ سے واقفیت اور نکھرا ہوا ذوق ضروری ہے یہ ضروری نہیں کہ جس زبان کی تصنیف کا ترجمہ کرنا ہے اس زبان پر بھی ترجمہ کرنے والے کو ماہرانہ عبور حاصل ہو، یا وہ اصل عبارت یا اصل تصنیف والی زبان میں خود بھی اسی طرح بے تکلف اور بے تکان لکھ سکتا یا بول سکتا ہو۔ بلکہ اس زبان کا صرف کتابی علم کافی ہے۔ اگر کتابی علم بھی نہ ہوا تو خیال کی نزاکتیں ہاتھ سے نکل جائیں گی۔ اصل عبارت کی نوک پلک پر ترجمہ کرنے والے کا دھیان نہیں جائے گا۔ اور وہ اسے ترجمے میں منتقل کرنے کی وجہ سے غافل رہے گا۔

اصل تصنیف یا اصل عبارت کی زبان کا علم صرف کتابی نہیں بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہو تو اور اچھا ہے۔ جتنا زیادہ ہو اتنا ہی اچھا۔ لیکن کم از کم اتنا ضرور ہو کہ اصل عبارت کے سیاق و سباق کو سمجھ سکے۔ یہ پا سکے کہ فلاں قسم کا لفظ نظر انداز کر کے فلاں مصنف نے یہ لفظ خاص اس مقصد سے رکھا ہے۔ یہ مقصد اگر سمجھ میں آجاتا ہے تو پھر اس زبان میں جس زبان میں ترجمہ کیا جا رہا ہے۔ اس مقصد کو کسی ہم پلہ لفظ سے پورا کیا جا سکے گا ورنہ نہیں۔

لفظ اور لغت

ہم پلہ لفظ کے سلسلے میں ایک نکتہ بے حد اہم ہے وہ یہ کہ کسی ایک زبان کے الفاظ کے ہم پلہ لفظ دوسری زبان میں بہت کم ہوتے ہیں۔ ممکن ہے چھ سات فیصدی سے زیادہ نہ ہوتے ہوں وہ بھی اسما اور افعال میں سینکڑوں الفاظ جو ہم روزمرہ بولتے اور لکھتے ہیں اور جو عام لوگوں کی زبان پر چڑھے ہوئے ہیں۔ اگر غور کیجیے تو ان کے مرادف لفظ بالکل اسی قدر و قیمت اسی مفہوم اسی کیفیت اور اسی چاشنی کے لفظ انگریزی جیسی وسیع اور مالا مال زبان میں نہیں ملیں گے۔ مثلاً عیب، ہنر، سلیقہ، رچاؤ، چاٹ، الاؤ، نشہ، جوڑ توڑ، آنکھ کا پانی، آڑ۔ یہ سب معمولی استعمال کے لفظ ہیں اور لغت میں ان سب کے ہم معنی الفاظ بھی دیے ہوئے ہیں مگر بعض خاص پہلو ایسے سینکڑوں الفاظ میں ہیں، جو ان کے ہم معنی انگریزی لفظوں میں نہیں ہوں گے۔ اور اسی طرح ہم معنی انگریزی لفظوں کے اور پہلو ایسے ہوں گے۔ جو ان ہندوستانی لفظوں سے سروکار نہیں رکھتے۔ اس لیے ہر ایک ہم معنی الفاظ لازمی طور سے ہم پلہ لفظ نہیں ہوتا۔ یہ نہ تو اردو کی کوتاہی کا ثبوت ہے نہ انگریزی کی وسعت کا مثلاً چاٹ چٹخارا، چسکا اور ٹھرک قریب قریب ہم معنی لفظ ہیں، لیکن ہر ایک میں کتنی برابر فرق پڑتا ہے۔ کمپرومائز Compromise عام استعمال کا ایک انگریزی لفظ ہے جسے ہم اپنے روزمرہ میں شمار کرنے لگے ہیں۔ لیکن انگریزی میں اس کا مفہوم سمجھوتے کے علاوہ بھی ہے۔ یعنی ۔ ۔ ۔ ۔ پر آنچ آنے دینا یا جوکھم، لغت سے مدد لے کر بھی ہم اس کا کوئی ہم پلہ یا برابر کا لفظ نہیں چن سکتے۔ چناں چہ جس طرح یہ حقیقت ہے کہ دنیا کی کوئی زبان

دوسری زبان کی لغت پیش نظر رکھ کر نہیں بنائی گئی اسی طرح یہ بھی واقعہ ہے کہ ہر زبان کے اپنے الفاظ، محاورات، روزمرہ اور صفات، اسی نہیں، خود وہیں کے سماجی حالات، تاریخی دور یا تہذیبی ارتقا سے پیدا ہو جاتے ہیں یا ان کے معنی میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ دو الگ زبانوں کے لفظ کا ہم معنی ہونا مگر ہم پلہ نہ ہونا ایک طرف تو یہ جتاتا ہے کہ لفظ کے مفہوم کو لفظ سے ادا کرنا اکثر اوقات غلط ہے اور دوسری طرف کوئی یہ دعویٰ بھی نہیں کر سکتا کہ ایک خاص مفہوم جسے ایک ترقی یافتہ زبان میں یوں ادا کیا گیا ہے۔ وہ دوسری ترقی یافتہ زبان میں کسی طرح ادا کیا ہی نہیں جا سکتا ہر ایک ترقی یافتہ زبان میں نازک سے نازک مفہوم ادا کیا جا سکتا ہے۔

پھر وہ کیا شے ہے جو نازک سے نازک مفہوم کو ادا کر سکتی ہے؟ وہ ہے ترتیب الفاظ اسی بات کو ایک جملے میں کہا جا سکتا ہے کہ اہمیت لفظ کی نہیں ہوتی۔ اہمیت لفظوں کے تال میل کی ہوتی ہے، یہاں بھی فرد بے جماعت یوسف بے کارواں ہے۔ جو منصب کسی لفظ کو جملے یا عبارت میں حاصل ہے۔ وہی منصب اس کے معنی اور اس کی حیثیت طے کرتا ہے۔ لفظ کا ہم پلہ ہونا ترجمے کی خوبی نہیں بلکہ ترجمے کی خرابی ہے۔ الفاظ کی ترتیب اور اس ترتیب سے پیدا ہونے والے خاص مفہوم کا ہم پلہ ہونا اسی لیے ترجموں کو لفظوں کے تال میل ان کی بندش اور جملے کے مفہوم کی کسوٹی پر ہی پرکھا جا سکتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات تو آوازوں کے اتار چڑھاؤ یا کھٹکے کی کیفیت بھی ترجمے میں اہمیت رکھتی ہے۔ مثلاً سعادت حسن منٹو کا مشہور افسانہ "ٹوبہ ٹیک سنگھ" ایک دیوانے کی بڑ ہے۔ مگر بامعنی بڑ ـــــ اپنی آواز کی بدولت وہ پنجاب کے بٹوارے کے خلاف ایک ہولناک چیخ بن گئی۔ کسی بھی زبان میں اس کا ترجمہ کیا جائے تو 'مونگ کی دال' اور گالیوں کے الفاظ کا ترجمہ نہیں ـــــ ان لفظوں کی صوتی کیفیت کا بعینہٖ کسی صورت سے ریکارڈ کرنا لازم نہ ہوگا۔

یہیں سے پتہ چلتا ہے کہ کیوں اچھے ترجموں کو لغت سے صحیح یا عمدہ ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ اول تو عام طور سے لغتوں کی ترتیب ان غیر ملکیوں کے ہاتھوں ہوتی ہے جو دونوں یا تینوں زبانوں میں کوئی ایک مادری زبان رکھتے تھے اور دوسری یا تیسری سے محض کام

گہری واقفیت۔ مادری زبان اور علمی زبان کی آگاہی میں یوں بھی بڑا بل ہے۔ اردو اور انگریزی کے الفاظ سے متعلق جتنے درجنوں لغت ہمارے پاس موجود ہیں۔ ان میں مولوی عبدالحق اور پلاٹس Platts کا لغت سب سے مستند سمجھے گئے ہیں۔ لیکن جن لوگوں کو ان دونوں لغات سے اکثر واسطہ پڑتا ہے وہ بے بسی سے بارہا دوچار ہوئے ہوں گے۔

لغت کا کام اگر ترجمے میں مدد دیتا ہے تو ایک زبان سے دوسری یا تیسری زبان کا کوئی ایسا لغت مکمل اور مستند اور بے عیب نہیں ہو سکتا جسے صرف ہم زبان لوگوں نے مل کر تیار کر دیا ہو۔ مثلاً اگر روسی اردو یا اردو روسی ترجمہ کرنا ہو تو صرف اسی لغت کا تکیہ کرنا چاہیے جسے دونوں اہل زبان فریقوں نے باہمی کوشش سے ترتیب دیا ہو۔ اور یوں بھی ایک سے زیادہ زبانوں کا لغت اسی صورت سے ترتیب دیا جانا چاہیے۔

مختصر یہ کہ لغت کام تو دیتا ہے مگر کم۔ جو چیز لغت سے زیادہ کارآمد ہے وہ ہے اس زبان کے ادب کا وسیع اور عام مطالعہ جس سے ترجمہ کیا جا رہا ہے۔ مثال کے طور پر میرے سامنے اردو کا ایک تازہ ترین ترجمہ رکھا ہوا ہے جس کا موضوع سیاسی بحث ہے اس کے مترجم خود ایک سیاسی سوجھ بوجھ کے آدمی ہیں۔ اپنی زبان پر انھیں کافی قدرت حاصل ہے۔ اور وہ اپنی زبان میں بے عیب لکھ اور بول سکتے ہیں۔ لیکن ترجمے میں کئی گوشے خالی پڑے ہیں۔ اصل کتاب روسی زبان میں لکھی گئی ہے۔ وہاں سے انگریزی میں ترجمہ ہوئی۔ انگریزی سے اردو میں لائی گئی ——— انگریزی عبارت میں ایک جگہ لکھا ہے کہ یہ آئین چھوٹی بڑی قوموں کے Equilibirium پر قائم ہے اب اگر لغت کھول کر دیکھا جائے تو "اکوی لی بریم" کے معنی ملیں گے۔ "توازن" غیر جانبدارانہ حالت وغیرہ ذی علم ترجمہ کرنے والے نے یہی لفظ وہاں اٹھا کر رکھ دیا ہے۔ حالاں کہ اگر مفہوم محض توازن یا غیر جانب داری ہوتا تو Balance یا State of neutrality لکھا جا سکتا تھا۔ اصل مصنف نے ان الفاظ کو رد کر کے خصوصیت سے Equilibirium لکھا تو اس کے پورے مفہوم میں کچھ اور بھی شامل ہے۔ کیا شامل ہے؟ یہ بات پوری

عبارت سے اور اس لفظ کے سارے امکانات کو جاننے سے یہی معلوم ہوتی ہے اس میں غیر جانب داری اور توازن کے ساتھ برادرانہ تعلقات اور ہم آہنگی کا مفہوم بھی پوشیدہ ہے چناں چہ ایسے موقعے پر "اکوی لی بریم" کا ترجمہ اگر جذب باہم[1] اور ہم آہنگی کیا جائے تو ترجمہ مصنف کے مفہوم کو پوری طرح ادا کر سکے گا۔

۲۔ دوسری شرط یہ ہے کہ جس زبان میں ترجمہ کرنا ہے۔ اس پر ماہرانہ عبور حاصل ہو۔ تصنیف کی زبان سے کہیں زیادہ قدرت اس زبان میں ہونی چاہیے۔ جس میں ترجمہ کرنا مقصود ہے۔ یہاں تک کہ اس زبان میں خود لکھ لینے کی اچھی خاصی مشق اور اس زبان کا پہلو دار علم ہونا چاہیے۔ پہلو دار علم سے مراد یہ ہے کہ اس کے ماخذ کا جہاں جہاں سے وہ سیراب ہوئی ہے۔ ان سرچشموں کا، اس کے نشیب و فراز کا علم ہو، الفاظ کہاں سے آئے، کیوں کر آئے، ان کے لغوی معنی کیا تھے۔ اصطلاحی معنی کیا ہو گئے اور کیا کیا ہو سکتے ہیں۔ ان کے روزمرہ اور محاورے کیوں کر بنے، انھیں مختلف موقعوں پر کیسے کیسے استعمال کیا گیا۔ اور آئندہ کیسے استعمال کیا جا سکتا ہے، ان میں مختلف اوقات میں کیا تبدیلیاں ہوئیں اور ان تبدیلیوں کی بنیاد پر اور کیا تبدیلیاں ممکن ہیں۔ ان کی مدد سے اور نئے سانچے کیسے بن سکتے ہیں۔ ایک ہی لفظ کتنے مفہوم اپنے دامن میں رکھتا ہے۔ اور ایک ہی مفہوم کو جب مختلف نسبتوں سے ادا کیا جائے تو اس کے لیے کتنے مختلف وزن کے الفاظ موجود ہیں۔

ارتقائی عمل

یہ باتیں جاننے کے لیے عمر نوح کی ضرورت نہیں اور نہ یہ کہ پہلے ایک زبان کو آخری تک کھنگال ڈالے اور غوطے لگانے سے فراغت حاصل کر لی جائے تب جا کے آدمی ترجمے کے لیے قلم اٹھائے۔

---

[1] ظاہر ہے کہ یہ لفظ ہمیں علامہ اقبال کے ادب سے مل جاتا ہے۔
"جذب باہم جو نہیں محفل انجم بھی نہیں"

کسی زبان کا اس درجہ علم ہونا دراصل ایک ارتقائی عمل ہے۔ یہ دھیرے دھیرے ہوتا رہتا ہے اور اگر توجہ رکھی جائے تو ترجمے کے دوران ہی یہ عمل جاری رہتا ہے۔ خود ترجمہ اس سلسلے میں تربیت گاہ بن جاتا ہے۔ لیکن اگر اس بوجھ کو غیر ضروری سمجھ کر ڈال دیا جائے تو کبھی نہیں اٹھتا۔ لوگوں کی عمریں گزر گئیں ترجمے کرتے کرتے لیکن اب تک اس قابل نہیں ہوئے کہ جس زبان میں روزانہ ترجمہ کرتے ہیں۔ اسی زبان کے الفاظ، محاورات، ترکیبوں، استعاروں اور تلمیحوں کا پورا مفہوم سمجھ سکیں۔ خود لکھنا تو درکنار۔

اس ارتقائی عمل کی پہلی منزل یہ ہے کہ جس زبان میں ترجمہ کرنا ہے اس زبان کے ادب سے بنیادی واقفیت ہو اور سلسلہ جاری رہے جتنا ممکن ہو قدیم اور جدید ادب کا مطالعہ بڑھایا جائے۔ ادب ایسا وسیع میدان ہے کہ اس میں مختلف موضوعات کسی نہ کسی سمت سے آ ہی نکلتے ہیں اور اس طرح مختلف موضوعات اور شعبوں سے مثلاً معاشیات، تاریخ فلسفہ، عمرانیات، جغرافیہ اور مذہبیات، سیاسیات وغیرہ کی اصطلاحوں اور ترکیبوں سے جان پہچان بڑھتی ہے، بیان کی نئی نئی صورتیں، نئے نئے اسلوب معلوم ہوتے ہیں اور پھر آسانی ہو جاتی ہے کہ پڑھنے والے کا رجحان جدھر زیادہ ہو وہ اسی طرف رخ کرلے۔ اور اسی موضوع کی کتابوں کا اور مباحث کا مطالعہ اختیار کرلے۔ جب یہ صورت ہو جاتی ہے تو اس خاص شعبے یا موضوع کی کتابوں کا ترجمہ آسان نظر آنے لگتا ہے۔ اور پھر جب اس موضوع پر مستقل تصانیف یا مضامین کا ترجمہ کوئی کرنے بیٹھے تو اسے یہ مدنظر رکھنا چاہیے کہ جن جن الفاظ کی خاص طور سے اس کو ضرورت پڑتی ہے یا جن سے پہلا واسطہ پڑتا ہے اگر ان کے مترادفات رواں نہیں ہوئے ہیں تو ساتھ ساتھ ان کی تخلیق کرتا جائے، ان کی ایک فہرست تیار کرلے جس پر بار بار رندا پھیرتا رہے۔ تو خود ہی اگلی منزلیں آسان ہوتی چلی جائیں گی۔ ورنہ روزمرہ استعمال کے لفظوں کی طرف سے بھی غفلت برتنے کی عادت ہو جائے گی۔ یہ عادت ترجمے کے کام پر برا اثر ڈالتی ہے۔ اور ادنیٰ غلطیوں سے بھرے ہوئے گڈمڈ ترجمے ہونے لگتے ہیں۔ مثلاً ابھی چند روز ہوئے کئی زبانوں سے باخبر ایک ترجمہ کرنے والے نے ٹیگور کے ڈرامے "اچلیاتن" کا ترجمہ لکھا ہے۔ "لڑکھڑاتا ہوا گھر" ظاہر ہے کہ یہ بے پروائی کا نتیجہ ہے۔ یہ بے پروائی

مستقل ہو جائے تو نادانی اور بے خبری بن جاتی ہے۔ "اچلیاتن" بنگالی لفظ ہے جس کے معنی ہیں وہ گھر جس کی دیواریں بوسیدہ ہو چکی ہوں، چھت بیٹھ چکی ہو اگرچہ بظاہر وہ دیوار سے محروم نہ ہوا ہو لیکن جلد ہی کھنڈر بننے والا ہو۔ لہٰذا "اچلیاتن" کا ترجمہ اگر ایک نئی ترکیب یا دو لفظوں میں کرنا تھا تو اسے "دھستا ہوا گھر" یا "گرتا مکان" کہہ سکتے تھے۔ "لڑکھڑاتا" وہ ہے جو چلتا ہے۔ لڑکھڑانا، ڈگمگانا، ڈانواں ڈول ہونا اور ڈھنا یا بیٹھنا اپنے ساتھ الگ الگ نسبتیں رکھتے ہیں۔ کسی لفظ کی نسبت شرابی اور مدہوش سے ہے کسی کی نسبت کمزور اور ناتواں سے، کسی لفظ کی چول ٹھیک بیٹھتی ہے۔ کشتی یا جہاز کے ساتھ اور کسی کا رشتہ مکان یا دیوار سے ہے۔ یہ الگ الگ نسبتیں ترجمہ کرتے وقت ذہن میں رہنی ضروری ہیں۔ شاعر کہتا ہے۔

گر یہی ہے اس گلستاں کی ہوا
شاخِ گل اک روز جھونکا کھائے گی

جھونک کھانا، اور جھونکا کھانا، دونوں ہم معنی فعل مرکب ہیں۔ شعر میں گلستاں اور شاخِ گل کی نسبت سے جھونکا کہا گیا۔ اب ہم کسی نازپروردہ نوجوان کو بگڑتا دیکھ کر بھی کہہ سکتے ہیں کہ "اک روز جھونکا" کھائے گا (گی)، ترجمے میں اس فعل کے استعمال سے پہلے داہنے بائیں اس کی نسبتیں دیکھ لی جائیں کہ کس نے کس کو خطاب کرکے کہا۔ ورنہ ایک خوبصورت استعارہ عبارت کا کوبڑ بن جائے گا۔ یہ مشق بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اگر لوگوں کی بولی پر، ادب کی رنگارنگی پر، زبان و بیان کے اچھے نمونوں پر صاحبِ طرز ادیبوں کے طرزِ ادا پر اور اپنے کام کی ذمہ داری پر نظر رکھی جائے۔ ورنہ بالکل ممکن ہے کہ ترجمہ کرنے میں مترجم قدم قدم پر خود بخود لڑکھڑاتا رہے۔

یہیں سے ایک سوال کا حل اور ملتا ہے کہ جس زبان میں ترجمہ کیا جا رہا ہے ممکن ہے اس میں اصل عبارت جیسے ٹکے بندھے الفاظ یا مستقل اصطلاحیں اور محاورات یا ترکیبیں موجود نہ ہوں۔ اگر زبان کا دامن ایسے اجزا سے خالی ہے تو ترجمہ کرنے والے کی ذمہ داری اور بڑھ جاتی ہے۔ یہ ذمہ داری ادا ہو جائے تو ترجمے کا مقام بلند ہو جاتا ہے۔ اور اس کے ساتھ

www.kitaabistan.com

ترجمہ کرنے والے کی صلاحیت بھی بڑھتی ہے۔ یہ ذمہ داری ہے اس بات کی کہ پرانی ترکیبوں کی مدد سے نئی ترکیبیں اور پرانے الفاظ کے سہارے سے نئے نئے الفاظ تراشے جائیں۔

مثال کے طور پر ۱۹۴۴ء کے اختتام پر انگریزی اخبارات میں ایک لفظ استعمال ہونا شروع ہوا ہے۔ War monger نہ اس کا ترجمہ "جنگ جو" صحیح ہو سکتا ہے نہ "لڑائی پھیلانے والا" دونوں لفظوں کا مفہوم ان مفاہیم کے سوا بھی ہے۔ لیکن وہ لوگ جو "وار مونگر" کے مفہوم سے تو واقف تھے مگر اپنے یہاں کے "وار مونگروں" کے روزمرہ اور محاورے سے ناواقف، وہ اسے کبھی آدھے آدھے جملوں میں اور کبھی غلط سلط لفظوں میں ادا کرتے رہے۔ ہندی اور گجراتی زبانوں میں وہ "جنگ خور" اور "یدھ خور" رہ گیا۔ "خور" کی ترکیب کہاں سے آئی۔ بجائے خود دلچسپ بات ہے، لیکن اردو میں ایک بار میں نے اسے "جنگ باز" لکھنے کی جرأت کی۔ یہ ترکیب ہماری زبان کے لیے بالکل نئی تھی مگر بے جوڑ یا اجنبی نہیں تھی۔ اس کے پیچھے جتنی گندی عادتوں کی "بازیاں" ہیں۔ سب کی غلاظت چھپی ہوئی تھی۔ اور مفہوم قطعاً وہی جو "وار مونگر" کا ہے۔ چناں چہ یہ لفظ چل پڑا۔ اسی طرح اردو زبان میں ترجمے کے ذریعے ہزاروں لفظ آئے اور کھپے ہیں، دوسری زبانوں کے اسموں نے افعال کا بھی ذخیرہ بڑھایا ہے۔ "شرمانا" سے لے کر "فلمانا"، "قبونا"، "برقانا" اور "قومیانا" تک کی اصطلاحات اس ضمن میں آتی ہیں۔

اسی طرح کی ایک اور مثال ہے۔ عربی میں ایک ترکیب ہے "معرض الی الشاقۃ" یا "شائق الصعب"۔ یعنی وہ شخص جو مصائب اور مشکلات کی طرف لپکتا ہو۔ اتنے بڑے مفہوم کے لیے اگر اردو سے واقفیت ہو تو غالب کی استعمال کی ہوئی محض ایک ترکیب کافی ہے۔ "دشوار پسند"[1] یا "مشکل پسند"[2] اب اس سے ہٹ کر وہ شخص جس کی پسندیدگی حاصل کرنا بہت مشکل ہو یا وہ جس کا ذوق نظر اتنا بلند اور اتنا انوکھا ہو کہ کہیں ٹھہرتا نہ ہو یا جس کی

---

[1] ہے نوآموزِ فنا ہمت دشوار پسند — سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

[2] شمارِ سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا — تماشائے بہ یک کفِ بردنِ صد دل پسند آیا

پسند یا نگاہِ انتخاب میں بڑی مشکل سے کوئی چیز جچتی ہو Fastidious یا Squesmish اس کے لیے عموماً اب تک ایک ترکیب "تنک مزاج" یا "نازک مزاج" استعمال ہوتی رہی ہے۔ لیکن اس ترکیب میں وہ خوبی اور جامعیت نہیں جو دشوار پسند میں ہے۔ اب اگر اردو ادب کا رچا ہوا ذوق ہے اور الفاظ کی ساخت اور ترکیبوں کی بناوٹ پر نظر ہے تو ترجمہ کرنے والا ایسے موقع کے لیے "پسند دشوار" کا لفظ ایجاد کرے گا اور ایسے ڈھب استعمال کرے گا کہ مفہوم بھی واضح ہو جائے اور زبان میں ایک اچھی ترکیب کا اضافہ ہو۔ جو خود اسی کے ادبی لہجے کی دین ہے پھر اسی ترکیب "پسند دشوار" سے "پسند دشواری" صفت بنائی جا سکتی ہے۔

مگر ترجمے کی اس شرط کو پورا کرنے کے لیے پھر میں دہراؤں گا کہ اس زبان کا گہرا علم اور اچھا سلجھا ہوا ذوق رکھنا ضروری ہے جس زبان میں ترجمہ کیا جا رہا ہے۔

۳۔ تیسری شرط خیال اور مفہوم کی پوری ادائیگی کی یہ ہے کہ جس موضوع کی اصل ہے اس موضوع سے مناسب حد تک واقفیت ہو۔ کیوں کہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی اصطلاح یا ایک ہی ترکیب یا ایک ہی لفظ ادب میں کچھ اور معنی رکھتا ہے۔ معاشیات میں اس کے معنی کچھ اور ہو جاتے ہیں اور نفسیات میں اس کا الگ مستقل مفہوم ہے اور تاریخ میں وہ محض لغت کے ایک عام لفظ کی طرح استعمال ہوا ہے۔ اب اگر ترجمہ کرنے والے کو یہ معلوم نہیں کہ فلاں فلاں ترکیب اس موضوع کی خاص اصطلاحیں ہیں اور ان کا اس شعبے یا اس علم میں الگ ایک مفہوم ہے تو وہ لغت کی مدد سے ترجمہ کر دے گا۔ اور عبارت کا سارا مفہوم غارت ہو جائے گا۔ یہاں تک کہ اگر خود اس سے کہا جائے کہ تم اپنا ترجمہ پڑھ کر اس کا مطلب سمجھاؤ تو وہ نہیں سمجھا سکے گا۔ مثال کے طور پر Surplus Value کی ترکیب میں "Surplus اور Value الگ الگ دونوں الفاظ انگریزی میں عام استعمال ہوتے ہیں اور اگر کسی عام عبارت میں آئیں تو پہلے کا ترجمہ "فالتو" یا "فاضل" یا "ضرورت سے زیادہ" لکھ دینا

www.kitaabistan.com

مناسب ہوگا۔ اور دوسرے کا "قدروقیمت" درجہ حیثیت، وقعت" وغیرہ ہوتا ہے۔ لیکن اب اگر یہی الفاظ پولیٹکل اکانومی سیاسی معاشیات کی کسی کتاب میں آئے ہیں اور مترجم معاشیات سے بالکل بے بہرہ ہے تو ان کی اصطلاحی اہمیت پر اس کی نظر نہیں جائے گی۔ اور وہ ترجمے میں فالتو حیثیت" یا ضرورت سے زیادہ وقعت لکھ جائے گا۔ حالاں کہ یہ اصطلاح مارکسی نظریۂ معاشیات کی تحتِ جگر ہے۔ اور اب اردو میں اس کے لیے "قدرِ زائد" لکھا جاتا ہے۔ ایک جملے میں اس کا مفہوم یہ کہ پیداوار میں لگی ہوئی محنت کی وہ قدر (ویلیو) جس کا معاوضہ مار لیا جاتا ہے۔

اردو زبان کے کسی پروفیسر نے ایک تنقیدی کتاب پر انگریزی میں مضمون لکھا۔ اردو کی اس تنقیدی کتاب میں جا بجا ادبی تنقید کی اصطلاحیں مثلاً واقعیت نگاری اور حقیقت نگاری استعمال ہوئی تھیں۔ انھوں نے ترجمہ کرتے وقت دونوں اصطلاحوں کا صرف لغوی مفہوم ٹٹول کر دونوں کو ہم معنی سمجھا اور ان کے لیے اپنے انگریزی تبصرے میں Fact finding اور Fact writing کی ترکیبیں استعمال کر ڈالیں۔ جو دراصل کسی سرکاری رپورٹ یا کسی کالج کی ریسرچ سوسائٹی کے معاملات میں استعمال ہونا چاہیے تھیں۔ حقیقت نگاری" اور "واقعیت نگاری" کا فرق تو ترجمے کی عبارت سے غائب ہوا ہی تھا اب یہ دونوں جو تنقیدی اصطلاحیں اور ادبی رجحان رہے ہیں۔ ان کا مفہوم بھی رخصت ہوگیا۔ کیوں کہ realism اور Naturalism کو "فیکٹ فائنڈنگ" سے دور کی بھی نسبت نہیں۔ اردو سے انگریزی میں ترجمہ کرنے والے پروفیسر انگریزی پر اچھا خاصا عبور رکھتے ہیں، اردو کی تعلیم دیتے ہیں۔ لسانیات کی سائنس سے مناسب حد تک واقف ہیں۔ پھر بھی جس موضوع کی اصل عبارت تھی۔ چوں کہ وہ اس موضوع سے غافل تھے۔ بھٹک گئے۔

یہ تو بہت معمولی مثالیں ہیں۔ ترجموں کے معاملے میں اصل تصنیف کے موضوع سے بےخبری نے بڑے عبرت ناک نتیجے پیش کیے ہیں اور ان موضوعات پر اپنی زبانوں میں اضافہ کرنے کی بجائے ان کی طرف سے بیزاری پھیلائی۔

ایک شخص ادب سے عموماً واقف ہے اور فلسفہ نہیں جانتا یا فلسفے کے موٹے موٹے

اصولوں سے بےخبر ہے تو وہ برٹرنڈ رسل کی کتاب کا ترجمہ کرتے وقت۔ برٹرنڈ رسل کی بات تو مسخ کرے گا ہی لیکن خود اس زبان میں فلسفے کے مضامین سے لوگوں کو نفرت دلائے گا جس زبان میں ترجمہ کر رہا ہے۔ ایک شخص سیاست کے میدان کا کھلاڑی ہے لیکن ادب کی چاشنی سے بہت کم واسطہ رکھتا ہے تو وہ میخائل شولوخوف کے ناول "ڈان بہتا رہا" کی ادبی نزاکتوں پر پانی پھیر دے گا یا جہاں ترجمے میں اٹکاؤ آئے گا۔ وہاں سے چھلانگ لگا جائے گا۔

جو لوگ کسی خاص موضوع کی کتاب یا مضمون سے گہری دلچسپی یا اس کے متعلق بنیادی معلومات نہ رکھتے ہوں، انھیں صرف زبان دانی کے بل پر اس موضوع کے ترجمے سے نہیں کھیلنا چاہیے۔ اور اگر وہ کسی وجہ سے ایسے موضوعات کی تصانیف کا ترجمہ کرنے پر مجبور ہو جائیں تو انھیں ایک ایک لفظ خوب ٹھونک بجا کر دیکھ لینا چاہیے کہ کہیں ان الفاظ و تراکیب سے اس موضوع کا کوئی خاص رشتہ تو نہیں ہے۔ اگر ہے تو پھر اس موضوع کے لغت یا ماہرین سے مشورہ لے لینا چاہیے۔ بہتر یہی ہے کہ مختلف ترجمہ کرنے والے اپنی دلچسپی اور اپنی لگن کے مضامین چھانٹ لیں اور اسی قسم کی تصانیف یا مضامین کا ترجمہ اپنے لیے مخصوص کر لیں۔ اس میں ترجمہ کرنے والے کا بھی فائدہ ہے۔ ترجمے پڑھنے والوں کو بھی سہولت ہے اور جس کا ترجمہ کیا جائے گا اُسے بھی سود و زیاں کا اندیشہ نہیں رہتا۔

ایک اور نکتہ

یہیں سے ایک نکتہ اور پیدا ہوتا ہے کہ موضوع اور اصل عبارت کے مضمون سے کیا مراد ہے؟ اس سے مراد صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ اگر عبارت معاشیات کی ہے تو معاشیات کی چند اصطلاحیں جان لی جائیں یا اگر ادبی موضوع ہے تو پہلے سے تھوڑی بہت ادبی سوجھ بوجھ پیدا کی جائے۔ بلکہ اصل موضوع سے واقفیت کے معنی کچھ اور بھی ہیں۔ اس

ﻠ یہ مفروضہ نہیں سامنے کی مثالیں ہیں۔

کے یہ بھی معنی ہیں کہ اگر کسی صاحبِ طرز ادیب یا مخصوص رجحان اور خاص ذہنیت کے مصنف کی تصنیف کا ترجمہ کرنا ہے تو اس ادیب یا مصنف کے طرزِ فکر سے رجحان اور ذہنیت سے آگاہی ہو۔ ضروری نہیں کہ پہلے سے اس کی تمام تصانیف کا درد کیا جائے بلکہ یہ کافی ہے کہ اس کی سوانح عمری یا زندگی کے خاص خاص حالات اور اس کے طرزِ بیان کے متعلق دوسروں کی رائیں معلوم کر لی جائیں۔ یہ بھی اگر ممکن نہ ہو یا بہت مشکل ہو تو آسان صورت یا کم از کم شرط یہ ہے کہ جس تصنیف کا ترجمہ کرنا ہے اسے خوب غور سے ایک بار اول تا آخر پڑھ لیا جائے۔ اور اگر ویسی ہی دو ایک تصانیف اور ہاتھ آسکیں تو ان کا بھی مطالعہ کر لیا جائے اور اگر زیرِ ترجمہ تصنیف پر دوسروں کی رائیں، تبصرے یا تنقیدیں یا تعارف مل سکیں تو ان پر ایک نظر ڈال لی جائے۔ اس کے بعد ترجمہ شروع کیا جائے۔

بعض ذمہ دار لوگ بھی اس شرط کی اہمیت کو نہیں مانتے۔ نتیجہ یہ کہ وہ اصل تصنیف کے ان اشاروں، کنایوں اور نکتوں کو نظر انداز کر جاتے ہیں جن سے پوری تصنیف کا لطف یا اہمیت قائم ہے۔

برناڈ شا کا ایک شہرۂ آفاق ڈراما ہے۔ Man and Superman اس ڈرامے کا ترجمہ ہوا ہے "نکتہ چین ہے غمِ دل ۔۔۔" کے نام سے۔ مترجم اس سے پہلے کئی اچھے ترجمے کر چکے ہیں اور انھیں انگریزی اور اردو دونوں زبانوں پر عبور بھی ہوگا۔ لیکن ڈرامے کے اصل موضوع کو پہلے سے جاننے اور خوب ذہن نشین کر لینے کو شاید اہمیت نہیں دیتے اور اصل موضوع کو ذہن نشین کر لینے کے سلسلے میں جو پہلو نکلتا ہے کہ مصنف کے طرزِ بیان، رجحان اور ذہنیت سے واقفیت حاصل کر لی جائے اسے اپنے اکثر ہم عصروں کی طرح انھوں نے بھی بالکل نظر انداز کیا ہے۔ چناں چہ جب وہ شا کے اس زبردست ڈرامے کا ترجمہ کرنے بیٹھتے ہیں تو پڑھنے والوں کی آسانی کی خاطر انگریزی ناموں کو بدل کر ان کی جگہ ہندوستانی اور وہ بھی متوسط طبقے کے مسلم نام رکھ دیتے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ کہ اصل اور ترجمے کے پورے ماحول اور تاثر میں اتنا فرق ہو گیا ہے جتنا اس انگریز میں ہو سکتا تھا۔ جو لندن چھوڑ کر نظام شاہی حیدرآباد میں چلا آتا اور درمیانی درجے کے کھاتے پیتے مسلم گھرانے کی معاشرت اختیار کر لیتا۔

برناڈ شا خود آئرلینڈ کا باشندہ ہے۔ آئرلینڈ اور انگلینڈ میں رقابت اور چشمک بہت پرانی ہے۔ لہٰذا اس کا آئرش ہونا کہیں نہ کہیں شوشہ چھوڑتا ہے۔ کبھی وہ انگریز کی زبان سے آئرش کے خلاف کوئی احمقانہ جملہ کہلواتا ہے۔ کہیں کسی آئرش کی زبان سے انگریز پر جملہ کستا ہے۔ کہیں آئرش کی برتری دکھاتا ہے اور کہیں ان کے بود و باش اور مزاج پر طنز کر دیتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص شا کے ڈرامے کا ترجمہ کرتے وقت انگریز ناموں کی جگہ ہندوستانی مسلمان نام رکھ دے تو لامحالہ اسے شہروں کے نام، فرنیچر کے نام اور دوسری ضروریات کے نام بھی بدلنے پڑیں گے۔ "پڈنگ" کو کھیر بنانا ہوگا۔ اور Pork کو معلوم نہیں کیا کرنا ہوگا اور جب یہ صورت ہوگی تو ظاہر ہے کہ انگلش کو ہندوستانی اور آئرش کو مصری یا قبطی یا چینی لکھنا پڑے گا۔ مثلاً اگر شا نے جملہ یوں لکھا ہے کہ "جی ہاں یہ آئرش لوگ ہوتے ہی ہیں۔ بہت ضدی" اور یہ جملہ انگریز کہہ رہا ہے تو انگریز کی جگہ ہندوستانی اور آئرش کی جگہ تبتی لکھ کر ترجمے کی جو تبا ہی ہوگی۔ ہر خوش مذاق آدمی اس کا اندازہ کر سکتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ شا کو سمجھنے کے لیے ایسا ترجمہ کتنا مفید ہو سکتا ہے۔

ترجمے کا یہ نقص پیدا اسی لیے ہوتا ہے کہ ترجمے کرنے والے کا اصل موضوع سے باخبر ہونا اور پھر اصل عبارت کے مصنف کے رجحان، مزاج اور طرزِ بیان کے نکتے معلوم کرنا کچھ ایسا ضروری نہیں سمجھا جاتا۔ حالاں کہ یہ بھی تقریباً اتنا ہی اہم ہے جتنا اس زبان کا علم ہونا جس سے ترجمہ کیا جا رہا ہے۔

اس لحاظ سے دیکھیے تو اردو زبان کے بعض پیش رو ترجمہ کرنے والے ہماری مبارکباد کے مستحق اور تقلید کے قابل ہیں۔ جن میں آخری دور عنایت اللہ دہلوی، مولوی عبدالحق، قاضی عبدالغفار، اختر حسین رائے پوری، ڈاکٹر عابد حسین اور ڈاکٹر ذاکر حسین سے ہوتا ہوا عزیز احمد اور حسن عسکری تک پہنچتا ہے۔

ترجمے کی بندشیں

ترجمے میں اصل کے خیال اور مفہوم کو پوری طرح ادا کرنے کے سلسلے میں جن شرائط

www.rekhta.com

کا ذکر آیا ہے اگر وہ تمام پوری ہوں تب بھی ترجمہ کرنے والے کو جگہ جگہ بعض اور سوالوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

مثلاً ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے اور یہ کافی اہم سوال ہے کہ جہاں اصل عبارت کا مفہوم صاف نہ ہو اور خود اصل کی عبارت ذرا الجھی ہوئی یا اس طرح لکھی گئی ہو کہ ایک کی بجائے کئی معنی نکلتے ہوں وہاں اپنے پڑھنے والوں تک بات پہنچانے کے لیے ترجمہ کرنے والے کا کیا فرض ہے؟

کیا اسے حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنی طرف سے اضافہ کر کے مطلب واضح کر دے یا وہ جو کئی مفہوم نکلتے ہیں، ان سب کو ویسے کے ویسے ہی لکھ دے؛ یا ترجمے میں بھی عبارت کو اتنا ہی گنجلک اور کثیر المعانی رہنے دے؛ یا سامنے کا ترجمہ دے کر حاشیے میں اس کے اور پہلوؤں یا اضافوں سے پڑھنے والوں کو باخبر کر دے۔

یہ تمام مشکلیں ترجمہ کرنے والوں نے اپنے اپنے طور آزمائی ہیں اور ان میں سے کوئی ایک صورت مسئلے کا آخری حل نہیں ہے۔

ایسی صورتوں کا حل بڑی حد تک اس موضوع کے اس حصے پر مصنف کی قوت بیان پر اور مصنف کے منشا پر منحصر ہے۔

(۱) ممکن ہے عبارت کا اصل مفہوم اس لیے صاف نہ ہو کہ مصنف کی قدرت بیان کے کارن وہ الجھا رہ گیا۔ اگر مصنف کو قدرت ہوتی یا اسے معلوم ہوتا کہ فلاں جگہ اس کی عبارت گنجلک ہے تو وہ اسے زیادہ وضاحت اور سلاست کے ساتھ بیان کرتا۔ اگر یہ صورت نظر آئے تو ترجمہ کرنے والے کی قابلیت اس میں ہے کہ ترجمے میں اپنی طرف سے کچھ الفاظ کا اضافہ یا

لہ منطق، فلسفہ اور معانی و بیان کی پرانی کتابوں کے جو عربی سے فارسی میں ترجمے کیے گئے وہاں یہ آخری صورت اختیار کی گئی ہے، بعض اوقات اصل عبارت دو گنے تگنے ہو گئی ہے۔ مرزا عسکری نے ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کی تاریخ ادب اردو کا ترجمہ کرتے وقت نہایت محتاط اور مختصر حاشیے بڑھائے ہیں۔

(ظ۔ا)

اندازِ بیان میں کچھ تبدیلی کر کے انھیں ایسے لکھے کہ عبارت سلجھ جائے۔

(۲) ممکن ہے اس مقام پر عبارت کو گنجلک رکھنے کا کوئی خاص مقصد ہو۔ بعض موقعوں پر یہی بات ضروری ہوتی ہے۔ خاص طور سے شاعری میں ایسے مقامات آتے ہیں جہاں نکتے کو سلجھانا ضروری نہیں ہوتا۔ آرٹ میں بعض جگہ تاریک گوشے اصل مقصود کو نمایاں کرنے کی نیت سے رکھے جاتے ہیں یا بعض جگہ ہلکے سے پردے کسی غیر ادبی مجبوری کی وجہ سے ڈال دیے جاتے ہیں کہ صاف بات کہی جائے تو کہیں اسے پڑھنے والے کی سوجھ بوجھ برداشت نہ کر سکے یا حکمتِ وقت برداشت نہ کرے یا مذہبی یا اخلاقی ادارے چراغ پا ہو جائیں یا بیان کے حسن میں فرق آجائے، مزا جاتا رہے۔ شاید ایسی کسی وجہ سے اصل مصنف نے اپنی عبارت کو ڈھکا چھپا رہنے دیا ہو ایسے مقامات کا اور مصنف کے اس مقصد کا اندازہ لگا لینا ترجمہ کرنے والے کی نکتہ دانی اور اچھی صلاحیت پر منحصر ہے۔ اگر وہ اسے پا لیتا ہے کہ یہاں عبارت کو اور زیادہ واضح کر دینے اور عام فہم بنا دینے سے اصل عبارت کی وہ ادا ہے جاتی رہے گی جو مصنف کا منشا یا ہنر ہے تو اپنے مصنف کی منشا کی پابندی کرنی چاہیے۔ اور عبارت کو جوں کا توں اپنی زبان میں منتقل کرنا چاہیے۔ جیسے دلہن کو ایک ڈولی سے دوسری ڈولی میں پہنچاتے ہیں اور اگر ایسا نہ ہوا تو ترجمہ ترجمہ نہ رہے گا بلکہ اصل عبارت کی تفسیر بن جائے گا۔ ترجمہ اور تفسیر میں جو بنیادی فرق ہے۔ وہ ظاہر ہے۔ تفسیر مصنف کے منشا کو اپنے طور پر کھول کر بیان کرنا ہوتا ہے۔ مفسر کو مترجم کے مقابلے میں آزادی میسر ہے۔ اسی سبب سے مفسر کے ساتھ اختلاف کی گنجائش مترجم کے بہ نسبت زیادہ رہتی ہے۔

خیام کی رباعیات کا منظوم انگریزی ترجمہ کرنے میں فٹز جیرلڈ سے اکثر یہی کمال سرزد ہوا ہے کہ وہ مترجم سے زیادہ مفسر نظر آتا ہے اور خیام کی شاعری کا ترجمہ کرنے کی آڑ میں وہ اپنی افتادِ طبع اور اپنے شاعرانہ جوہر کا لوہا منوا لیتا ہے۔

(۳) اب اگر مترجم دیکھتا ہے کہ اصل عبارت میں فلاں حصا ایسا ہے کہ اس کے کئی معانی نکل رہے ہیں یا نکل سکتے ہیں تو اسے ایسا سوچنا ہوگا کہ مصنف خود اس مقام پر کئی معانی پیدا کرنا چاہتا تھا؟ وہ ایک رنگ میں کئی ہلکے ہلکے رنگوں کی آمیزش رکھنا چاہتا تھا۔ یا اس کے ذہن

میں اپنا ایک مفہوم تھا اور وہ لفظ یا جملہ ایسا لکھ گیا۔ جس سے بہ یک وقت کئی شعاعیں پھوٹتی ہیں اور بیان کی یک رنگی یا وضاحت میں حائل ہوتی یا اسے بڑھاتی ہیں۔ یہاں پھر مصنف کے منشا کی پابندی کرنی ہوگی۔ اگر پہلی صورت ہے تو اسے زبان میں ترجمے کے لیے ویسا ہی لفظ ویسا ہی محاورہ ڈھونڈنا ہوگا۔ جو کئی کئی معانی کی طرف اشارہ کرتا ہو۔ اور اگر دوسری صورت ہے تو اسے اصل عبارت کی حدود سے آگے بڑھ کر ایسا لفظ تراشنا ہوگا جو چاہے لفظی ترجمہ ہو یا نہ ہو لیکن اس ایک مفہوم کے لیے سب سے زیادہ جامع اور مانع وہی ٹھہرے اسے اپنے ترجمے میں اصل کی عبارت یا جملے سے باقی تمام مفہوموں کو ہٹانا ہوگا اور صرف ایک کو آگے بڑھانا ہوگا۔ ممکن ہے بعض لوگ اس پر اعتراض کریں اور اسے ترجمہ کرنے والے کی دیانت داری کے خلاف سمجھیں لیکن ترجمے کی دیانت داری کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ مترجم بے غرض ہو کر اصل کے لفظ کی جگہ لفظ لکھتا چلا جائے۔ اور لکھی پر لکھی مارتا رہے۔

جن لوگوں نے لکھی پر لکھی مارنے کو ترجمے کی دیانت داری سمجھا ہے ان کی مثال ایک ایسے روکھے سخت گیر آدمی سے دی جا سکتی ہے جس نے بہتر کردار بنانے کی خاطر کچھ اصول بنائے ہوں اور وہ اصولوں کا ایسا پابند ہو چکا ہو کہ ان کی انسانیت دوستی کے عام تقاضوں کو ٹھکراتا چلے۔ ظاہر ہے کہ ایسی اصول پرستی نیکی کے لباس میں ایک مردم بیزار بدی بن جائے گی کہ ذریعہ تو مقصد کی جگہ قبضائے اور مقصد ذریعے کی نفی کرے۔

ترجمے میں مصنف کے الفاظ دوسری زبان میں منتقل کرنا دراصل ذریعہ ہے، مقصد نہیں مقصد تو مفہوم اور لطفِ بیان کی ادائیگی ہے۔ اگر الفاظ کو دوسری زبان میں منتقل کرنے سے وہ مفہوم پوری طرح ادا نہیں ہوتا یا اسی وصف کے ساتھ ادا نہیں ہوتا تو کٹر لوگوں کا ہر ایک الزام سہہ کر اصل کے الفاظ، ان کی تقدیم و تاخیر، ان کے جوڑ اور جملوں کی ساخت کو بدل کر یہ مقصد پورا کرنا ہوگا۔ یہی ترجمے کا مقصود ہے۔ اور اسی مقصود کی تعمیل خاص اس فن کی دیانت داری ہے۔

مثال کے طور پر کارل مارکس کی تصنیف Das Capital (کی جلد اول و دوم) جب جرمن زبان میں تیار ہو گئی تو اس کے چند سال بعد فرانسیسی، جرمن، انگریزی زبانوں

کے ماہر اور معاشیات کے فاضل T. Ray نے اسے فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا۔ یہ فرنچ ترجمہ مکمل ہو چکا تو مارکس نے اس پر نظر ڈالی۔ یہاں مارکس نے اس مترجم کے متعلق لکھا ہے۔

"اس نے خوب جی لگا کر احتیاط کے ساتھ اپنا فرض پورا کیا لیکن احتیاط اور توجہ میں اتنی شدت برتی کہ جو ترجمہ تیار ہوا وہ حد سے زیادہ لفظ بلفظ ہو گیا۔"

حد سے زیادہ لفظ بہ لفظ Too Literal ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ مارکس نے اسے قبول نہیں کیا، خود جم کر نظر ثانی کی اور اصل سے ہٹ کر اپنی ہی عبارت کے ترجمے میں جگہ جگہ کاٹ چھانٹ کر دی۔

بین السطور کا معاملہ

ترجمہ کرنے والے کو لازمی طور سے اصل عبارت کے الفاظ ہی نہیں بلکہ اس کے بین السطور کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیے اور بین السطور، جو مفہوم الفاظ کے درمیان پوشیدہ ہوتا ہے، کو ماہ گیر کی ٹارچ کے بطور استعمال کرنا چاہیے کہ جہاں ضرورت پڑی بٹن دبا کر روشنی حاصل کر لی۔

ہو سکتا ہے کہ ترجمہ کرنے والے کا اپنا بھی ایک طرزِ بیان ہو۔ ممکن ہے اور بخل مصنف ہونے کے رشتے سے وہ اپنا ایک طرزِ ادا بنا چکا ہو۔ وہ طرزِ ادا کافی پختہ ہو چکا ہو۔ ایسی صورت میں جب وہ ترجمہ کرنے بیٹھے گا اور اصل عبارت کے بین السطور پر بھی نظر رکھے گا، تو ممکن ہے کہ وہ مصنف کے منشا کی تو پابندی کرتا چلے لیکن طرزِ بیان اپنا ڈال دے۔ یا مترجم کی ہستی ترجمے کی عبارت پر حاوی ہو جائے۔ یہ ترجمے کا وہ عیب ہوگا جس کا کوئی سدھار نہیں، کوئی توڑ نہیں، اس سے نقصان یہ ہے کہ ترجمے پر اصل مصنف سے زیادہ مترجم پر توجہ رہے گی۔ اور اصل مصنف کا طرزِ بیان جو ترجمے میں جوں کا توں منتقل ہونا چاہیے تھا، گم ہو جائے گا یہ ایک طرح کی منجھائی یا پالش ہے۔ جو ترجمے کو مقبولیت بخشنے کے باوجود اصل مصنف کا آدھا وجود اور پورا وصف مٹی میں ملا دیتی ہے۔ پختہ کار اہلِ قلم کو خصوصاً ادھر سے ہوشیار رہنا چاہیے۔

ترجمہ کی تین راہیں ہیں۔ ایک لفظی ترجمہ، دوسرا آزاد ترجمہ اور تیسرا ان دونوں کے درمیان کا ترجمہ۔ اس تیسرے یا اعتدال کے ترجمے کو ہم تخلیقی ترجمہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ کیوں کہ جب ترجمے کی

تمام شرائط پوری ہوتی ہیں تو وہ صرف تقلید بالکل نہیں رہ جاتا۔ بلکہ اس میں ایک فنی حسن ابھرتا ہے ـــــ وہ اصل کو پوری طرح ہضم کر کے اسے نئے وجود کے ساتھ زیب و زینت بخشنے کے برابر ہے۔ اور اسی طرح بجائے خود تخلیق کے ہم وزن شمار ہونے کے قابل ہے۔

ترجمے کی ذمہ داری کے سلسلے میں سو باتوں کی ایک بات یہ ہے کہ ترجمہ کرنے والا اپنے وجود، خیال، جذبے اور اپنے قلم کو اصل مصنف کے سپرد کر دے اور یہ سوچ لے کہ اگر فلاں بات فلاں جملہ، تصنیف، عبارت یا محاورہ مصنف کو خود ہماری اسی زبان میں لکھنا ہوتا تو وہ کس طرح لکھتا۔ اپنی بساط بھر جو بھی تصور قائم ہو کہ وہ یوں لکھتا، بس ویسے ہی لکھ دینا چاہیے۔

اگر ترجمہ اس حیثیت سے کامیاب ہے تو ہر حیثیت سے کامیاب ہے اور لفظ بہ لفظ یا انتہائی دیانت دارانہ Faithful نہ ہونے کے باوجود ہر اعتبار سے مکمل ہے، ورنہ اور خوبیوں کے باوجود ناکام رہے گا۔

ختم کلام

یہاں تک ترجمے کے لیے جن شرطوں کی نشاندہی کی گئی۔ ان پر نظر ڈالنے کے بعد ایک مبتدی کا چمکنا، یا ترجمے کو ایسا بھاری پتھر سمجھ بیٹھنا بیجا نہ ہوگا۔ جسے صرف چوم کر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ حالاں کہ ایسا ہے نہیں۔

زندگی کے کام جتنے پیچیدہ ہوتے جاتے ہیں، اتنا ہی خاص کاری Specialisation بڑھتی جاتی ہے۔ ترجمہ بھی ایک خاص ہنر یا فن ہے اور دوسرے پیشوں یا ہنروں کی طرح یہ بھی تربیت اور ریاض طلب کرتا ہے۔ کلاسیکی موسیقی یا قدرتی سائنسوں کے مقابلے میں یہاں ریاض (یا ریاضت) کا تقاضہ ہلکا ہے۔ بلکہ اگر کوئی شخص ترجمے کو روزگار یا مستقل ذہنی مشغلے کے طور پر اپنانا چاہے اور ایک دو موضوعات کو اپنی طبیعت یا بساط کے مطابق چن لے تو کام اور بھی آسان ہو جاتا ہے۔ چند سال کا مطالعہ اور دو تین سال کی لگاتار مشق مل کر رواں ترجمے کے کامیاب راہبر ہیں۔

ترجمے کی ایک شاخ وہ ہے، جو محض مشق اور حافظے کے بل پر پھیلتی ہے۔ یعنی ترجمانی

(دو بھاشیہ کا کام)، تقریری زبان کو ایک سے دوسری میں ڈھالنا محض مشاقی ہے۔ اور ایک لفظ کے لیے دوسرے نپے تلے، مقررہ لفظ کی یادداشت ـــــ یہ نسبتاً سہل ہے۔

ترجمے کی دوسری شاخ کلاسیکی ادب یا جدید تخلیقی ادب کو دوسری زبان میں منتقل کرنے کا کام ہے۔ جو پہلی سے زیادہ دشوار، مگر پائدار ہے اور ہم نے اب تک اسی سے بحث کی ہے۔

لیکن ترجمے کی وہ شاخ جسے چھوتے ہوئے اہلِ علم کی انگلیاں جلتی رہیں، شعر کا شعر میں ترجمہ ہے۔ ہر زمانے میں اس کام کو نہایت دشوار سمجھا گیا۔ سر جان ڈینہم John Denibam نے تو اسے محض حماقت قرار دیا ہے۔ یہ کہہ کر کہ شاعرانہ زبان ایسی اسپرٹ رکھتی ہے کہ ایک زبان کی بوتل، سے دوسری میں ڈھلتے وقت اڑ جاتی ہے۔ مگر پھر بھی یہ "حماقت" دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں میں ڈیڑھ سو برس سے کی جا رہی ہے۔ نتیجے بھی برے نہیں نکلے۔ کالی داس، فردوسی نظامی، جامی، حافظ و سعدی، خیام، شیکسپیر، ملٹن، گوئٹے، بائرن، شیلے، پوشکن، مایاکوسکی ٹیگور اور درجنوں بڑے بڑے شعرا اپنی ملکی سرحدوں سے نکل کر دنیا کے شہری اور عالمی تہذیب کے میراث بن گئے۔ اور بنتے جا رہے ہیں۔

منظوم ترجموں کا رواج مشرق میں بھی تھا۔ لیکن اسے عروج ملا مغرب میں۔ خصوصاً فرانسیسی، انگریزی اور روسی زبانوں میں صفِ اول کے شعرا نے اس کام کو ہاتھ میں یا تو ایک فن ہو گیا کہ مشق کی پختگی اور قدرتِ کلام کے بلند مقام کو پہنچنے کے بعد مغربی شعرا دوسری زبانوں کے کلاسیکی یا ہم عصر شاعروں کا کلام منظوم ترجمے کے لیے چنتے ہیں اور اس میں اپنا جوہر دکھاتے ہیں۔ منظوم ترجمہ کرنے والے میں شاعرانہ جوہر ہی وہ عنصر ہے۔ جو ترجمے کی باقی تمام شرطوں کے علاوہ اوپر سے کام آتا ہے۔ جو شخص خود اچھا شعر نہ کہہ سکے، نہ کہہ چکا ہو، جسے اپنی زبان میں اساتذہ کے ہزاروں اشعار از بر نہ ہوں، جو دوسری زبان کے مصرعوں میں، نظموں میں اور نثر میں بھی، باطنی آہنگ اور ظاہری ترنم سے لطف اندوز نہ ہو سکے، اسے منظوم ترجمے کی طرف کبھی سر نہ دینا چاہیے۔ اور جو لوگ اس کام کے اہل ہیں انھیں بھی لازم ہے کہ ہر ایک اور کسی بھی رنگ کے شاعر پر ہاتھ صاف نہ کریں۔

سید ہاشمی فرید آبادی

ترجمے کے چند پہلو[1]

(اس موضوع پر سید ہاشمی فرید آبادی، عبدالمجید سالک
اور ممتاز حسین کے خیالات مذاکرے کی صورت میں
ماہِ نو کراچی مارچ ۱۹۵۲ء میں شائع ہوئے تھے۔
خ۔ا)

کسی نئی تصنیف یا جامع تالیف کا علمی رتبہ ترجمے پر فائق ہے لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ اچھا مترجم ہونے کی ایک شرط یہ ہے کہ اچھا انشا پرداز بھی ہو۔ بجائے کہ انشا پرداز کے لیے ضروری نہیں کہ دوسری زبان سے عمدہ واقفیت رکھتا ہو۔

انشا پردازی کے سلسلے میں خیال آیا کہ بعض اعلیٰ درجے کے مترجم ترجمے میں اپنا اسلوب نگارش پیدا کر دیتے ہیں۔ اس کی بہت اچھی مثال مولانا ظفر علی خاں کے تراجم ہیں کہ ہیگرڈ کے مترجمہ ناولوں میں بھی ان کی عبارت آرائی کا وہی رنگ جھلکتا ہے جو معرکۂ مذہب وسائنس میں نظر آتا ہے۔ لیکن عام طور پر مترجم کو اصل مصنف کی طرزِ تحریر کا اثر قبول کرنا پڑتا ہے۔ زیادہ مشکل اس وقت پیش آتی ہے جب کہ اصل عبارت (خصوصاً انگریزی) شاعرانہ یا خاص ادیبانہ رنگ میں لکھی گئی ہو۔ کسی دوسری زبان کے صنائع، تلمیحات، نازک استعارے اپنی زبان میں اسی حسن وخوبی سے ادا کر دینا خود مترجم کی انشا پردازی کا کمال سمجھنا چاہیے

---

[1] ترجمے کے چند پہلو (مذاکرہ) سید ہاشمی فرید آبادی، عبدالمجید سالک، ممتاز حسین مطبوعہ ماہِ نو کراچی مارچ ۵۲ ص ۴۵-۴۳۔

جو حضرات اپنی زبان میں رنگین عبارت آرائی کی مشق و مہارت نہیں رکھتے، ان کے لیے سلامتی کی راہ یہی ہے کہ ان موقعوں پر صاف اور سادہ زبان میں ادائے مطلب پر قناعت کریں۔

ایسے مرحلوں میں دونوں زبانوں کی قوتِ بیان، فصاحت اور معنویت کا بھی توازن واضح ہو جاتا ہے۔ ہمیں زیادہ تر انگریزی سے سابقہ پڑتا ہے اس کے متقدم انشا پرداز کارلائل اور رسکن سے قطع نظر زمانۂ قریب کے مورلے یا چرچل ہی کی کتاب کا ایک ورق ترجمہ کیجیے تو عام طور پر اردو تحریر ذرا ہلکی معلوم ہوگی۔ مگر اس میں زبان کا اتنا قصور نہیں جتنا اہلِ زبان کے ذہنی اور تعلیمی معیار کی پستی کو دخل ہے۔ گزشتہ پچاس برس میں اردو نے حیرت انگیز ترقی کی اور ہزاروں کتابیں تالیف و ترجمہ ہو کر ملک میں شائع ہوئیں۔ ان میں ہر صنف اور ہر درجے کی مطبوعات مل جائیں گی۔ لیکن چونکہ عام اور اعلیٰ تعلیم یورپ کے مقابلے میں بہت ہی کم ہے۔ اس لیے ادبی پیداوار میں وہ معنوی گہرائی نہیں پائی جاتی بارہ تیرہ سال کا ذکر ہے خالدہ خانم ادیب کی انگریزی کتاب "ان سائڈ ان اڈیا" چھپی تو سر اکبر حیدری مرحوم نے جناب مولوی عبدالحق صاحب سے فرمائش بلکہ تاکید کی کہ بہت جلد اس کا اردو ترجمہ تیار کرا دیا جائے۔ فرمائش کی تعمیل ہوئی۔ ترجمہ چھپ گیا اور اہلِ نظر نے پسند بھی کیا لیکن جیسا کہ مترجم نے دیباچے میں اشارہ کر دیا ہے۔ اس طرزِ عبارت کو قبولِ عام پانے کے لیے غالباً ایک مدت درکار ہوگی۔ اصل یہ ہے کہ فاضلہ مصنفہ بہت گہری اور کارگر تنقید کرتی ہے مگر اس پر باریک ریشم کے ایسے پردے اڑھا دیتی ہیں کہ علم و ذہانت کی عینک کے بغیر نہ کی بات نظر نہیں آتی اور جس شخص پر تنقید ہوئی ہے وہ چوٹ کھا کر بھی مسکراتا ہے۔

اردو ترجمے میں ابتری اور اس کی بدولت خود زبان کی فصاحت میں خرابی کا ایک سبب اردو روزنامے ہوئے، جن میں زیادہ تر انگریزی سے اطلاعات اور تار کی خبریں بہت جلدی میں ترجمہ کی جاتی ہیں۔ ان کی زبان (اور طباعت بھی) سخت اصلاح کی محتاج ہے صاف اور بامحاورہ زبان میں ترجمہ کرنے والے مشاق مترجم بھی تعداد میں کم اور مہنگے ہیں۔ اردو انشا پردازی کی طرح ترجمے میں ہمارے رسائل نے ضرور ترقی کی ہے۔

www.kitaabistan.com

انگریزی سے سلیس اردو میں ترجمہ کرنے کا ایک یہ گُر مترجم کو سیکھنا لازم ہے کہ جو، جس، جن، سے فقرے کو پیچیدہ نہ بنائے۔ ان کی انگریزی میں بڑی کثرت ہوتی ہے۔ ہماری زبان میں عطف و ربط کی دوسری تدبیریں کام میں لائی جاتی ہیں۔ سوائے فنی اصطلاحات کے بلیغ اور پُرمعنی الفاظ کا ذخیرہ بھی کچھ کم نہیں ہے۔ البتہ انھیں برتنے کے لیے مترجم کی علمی استعداد بلند اور اپنے معیاری ادب سے اسے خوب واقفیت ہونی چاہیے۔

عبدالمجید سالک

کسی علمی مضمون یا کتاب کا ترجمہ وہی کرسکتا ہے جسے اس کے موضوع سے شغف ہو۔ مثلاً کسی ادیب یا شاعر کو فلسفے کی کسی کتاب کا ترجمہ کرنے کی کوشش نہ کرنی چاہیے۔ نہ اقتصادیات کے کسی طالب علم کو طبیعیات کا ترجمہ کرنا چاہیے۔ کیونکہ ترجمہ "سمجھ لینے اور سمجھا دینے" کا نام ہے جو شخص کسی متن کو خود نہیں سمجھتا، وہ کسی کو سمجھانے میں کب کامیاب ہوسکتا ہے۔ اس کے علاوہ مترجم کے لیے دونوں زبانوں سے خاصی واقفیت ضروری ہے۔ نہ صرف لفظی واقفیت بلکہ انشائی استعداد ضروری ہے۔ ورنہ اصل کی روح ترجمے میں کبھی منتقل نہ ہو سکے گی۔ علمی تراجم میں سب سے بڑی مشکل مصطلحات سے متعلق ہے۔ جب تک علم کی اس شاخ سے جس سے کتاب متعلق ہے، اصطلاحاتی شناسائی نہ ہو، صحیح ترجمہ ممکن ہی نہیں۔ ایسے دماغ شاذونادر ہوتے ہیں۔ جو اگرچہ دونوں زبانوں میں سے کسی ایک سے زیادہ شغف رکھتے ہیں اور دوسری سے کم، لیکن اس کے باوجود اعلیٰ درجے کا ترجمہ کر لیتے ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد مرحوم سے کسی نے پوچھا۔ آپ انگریزی میں تو محض شدبد ہی رکھتے ہیں۔ پھر آپ نے تعزیراتِ ہند کا اتنا اچھا ترجمہ کیونکر کر لیا۔ انھوں نے جواب دیا کہ بلاشبہ انگریزی میں میری استعداد انٹرنس کے معیار سے زیادہ نہ تھی۔ لیکن اردو، فارسی اور عربی کی قابلیت کے باعث میں موزوں الفاظ و مصطلحات نہایت آسانی سے تجویز کر دیتا تھا۔ لیکن ہر شخص ڈپٹی نذیر احمد نہیں ہو سکتا جب تک دونوں زبانوں سے یکساں واقفیت نہ ہو کوئی شخص اچھا ترجمہ نہیں کرسکتا۔

"ادبی ترجمے" چونکہ ان کتابوں، افسانوں یا ادب پاروں کے ہوتے ہیں۔ جن کے

لکھنے والے زبان و ادب کے فنکار مانے جاتے ہیں اس لیے ان کا مترجم بھی فنکار ہونا چاہیے یونہی اٹھا کر سیدھے سبھاؤ ادبی شہ پاروں کا ترجمہ کر دینا اس فنِ لطیف پر ظلم ہوگا۔ میں جب کبھی ڈاکٹر ٹیگور کی بعض چیزوں کا ترجمہ کیا کرتا تھا تو مجھے ایک ایک لفظ کے ترجمے پر خاص طور سے غور کرنا پڑتا تھا۔ اگرچہ ساری کتاب میں ایک بھی ایسا لفظ نہ ہوتا جس کے معنی مجھے معلوم نہ ہوتے۔ لیکن اس کے باوجود میں ہر ضروری لفظ کے لیے ڈکشنری دیکھتا جس میں اس لفظ کے چھ سات معنی لکھے ہوتے۔ اب میں متن کی روح کے مطابق کوئی ایک لفظ چن لیتا اور فقرے میں نگینے کی طرح جڑ دیتا اور بعض اوقات تو الفاظ اور اجزائے جملہ کے ایسے ترجمے ہو جاتے۔ جو نہ صرف اصل کا ہو بہو چربا ہوتے، بلکہ اس میں بھی خاص رونق اور آرائش پیدا کر دیتے۔ مثلاً:

Patter of Rainfall on the dry Leaves

کا ترجمہ ہوا: "سوکھے پتوں پر بارش پڑ پڑ" Patter میں تو ٹیگور نے صرف صوتی اعتبار مدنظر رکھا تھا۔ میں نے صوتی اعتبار کو بھی ترجمے میں محفوظ رکھا اور لفظی رعایت سے "پڑتے" کا مفہوم بھی شامل کر دیا۔ ایک فقرہ تھا:

I am the God who was Born of the Mind of the Creator.

میں ترجمہ کیا: "میں وہ دیوتا ہوں جو کرتار کے من سے پیدا ہوا" ایک تو Creater کا ترجمہ "من" سے بہتر نہ ہو سکتا تھا۔ اور پھر Creater کا مفہوم دل، دماغ، ذہن سے ادا نہ ہو سکتا تھا۔ اس کے لیے "کرتار" ہی موزوں تھا۔ خصوصاً ایک ایسے ادب پارے کے ترجمے میں۔ جو ہندو علم الاصنام کی بعض ہستیوں کے متعلق لکھا گیا ہو۔ اور جس کا ترجمہ لازماً ہندی آمیز ہونا چاہیے تھا۔ ورنہ اس کی روح غائب ہو جاتی۔

طوالت کا خوف نہ ہوتا تو میں بیسیوں مثالیں دے دیتا۔ میرا مقصود یہ عرض کرنا ہے کہ ادبی چیزوں کا ترجمہ کرنے میں انتہائی احتیاط اور پابندی ملحوظ رکھنی چاہیے تاکہ اصل فنکار کی تخلیق کی کوئی صوری یا معنوی خصوصیت مسخ نہ ہونے پائے۔ اصل کے الفاظ کی پیروی اس کے فقروں کے بانکپن کی حفاظت اور اس کے بیان کی روح، غرض ہر چیز ترجمے میں منعکس

www.kitaabistan.com

ہونی چاہیے۔

اخباری ترجمے میں سب سے مقدم مصلحت یہ ہے کہ مطلب بالکل واضح اور عبارت قطعی طور پر سلیس ہو جائے تاکہ عام پڑھنے والوں کو کوئی الجھن نہ ہو۔ اس کے لیے اپنی زبان کا محاورہ سب سے بہتر رہنما اور معاون ہے۔ ایک انگریزی اخبار میں یہ فقرہ نظر پڑا۔

He was conveyed to his place of residence in an intoxicated condition.

اگرچہ انگریزی زبان کے اعتبار سے بھی یہ فقرہ لغو تھا۔ اور اصل میں یوں ہونا چاہیے تھا: He was carried home drunk لیکن ایک مبتدی مترجم نے اس کا ترجمہ یوں کیا۔

"وہ بحالت مخموری اپنے مقام سکونت کو لے جایا گیا۔"

اب آپ انصاف فرمایئے۔ کیا ترجمہ اس کو کہتے ہیں؟ کیا یہ اردو ہے؟ کیا ذیل کا فقرہ بالکل صحیح مفہوم ادا نہ کر سکتا تھا:

"وہ نشے میں تھا۔ اسے گھر لے گئے۔"

ایک مترجم صاحب نے جو اپنی عربی فارسی کی قابلیت کا اظہار کرنا چاہتے تھے انگریزی کے اس فقرے کا کہ:

there was an explosion in a coal mine resulting in the death of five persons.

یوں ترجمہ کیا کہ "ایک معدنِ زغال میں دھماکا ہوا۔ نتیجے کے طور پر پانچ نفوس کی ہلاکت وقوع پذیر ہوئی۔" میں نے مترجم صاحب کو جا کر کہا کہ اس فقرے پر آپ کو کیا اعتراض ہے۔ کہ "کوئلے کی ایک کان پھٹ گئی۔ پانچ آدمی مر گئے"۔ کیا آپ کے نزدیک یہ غلط اردو ہے۔ اصل خبر کا یہ ترجمہ غلط ہے؟ بیچارے اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ میں نے کہا ایک تو "نتیجے کے طور پر" نہایت بیہودہ جزوِ جملہ ہے۔ اس کو عمر بھر نہ لکھیے گا۔ دوسرے کسی آدمی کی ہلاکت وقوع پذیر نہیں ہوا کرتی" وہ صرف مر جاتا ہے۔ اور یہی کہنا چاہیے

ایک فقرہ تھا:

adverse climatic conditions prevented the progressive writers from holding their meeting.

ترجمہ کیا گیا کہ

"مخالف موسمی حالات نے ترقی پسند ادیبوں کا جلسہ منعقد کرنے سے روک دیا۔"

حالاں کہ سیدھا سادہ ترجمہ یوں ہونا چاہیے تھا کہ

موسم خراب تھا اس لیے ترقی پسند ادیبوں کا جلسہ نہیں ہو سکا۔" یا "موسم کی خرابی کی وجہ سے ترقی پسند ادیب اپنا جلسہ منعقد نہیں کر سکے۔"

میرا مطلب یہ ہے کہ اگر اخباری مترجم سادگی، سلاست اور محاورہ اردو کو مدِ نظر رکھ کر ترجمہ کریں تو خود بھی آرام سے رہیں اور پڑھنے والوں کے ذہن بھی نہ الجھیں۔ ان کو چاہیے کہ جہاں انگریزی فقرے کی ترکیب پیچیدہ اور طویل پائیں، وہاں اس کی چیر پھاڑ کر دیں۔ Complex فقرے کو چند Simple فقروں میں تقسیم کر دیں۔ اور ترجمہ کرنے کے بعد ایک دفعہ پڑھ کر دیکھ لیں کہ آیا اصل کا مطلب ادا ہو گیا۔ اگر ہر پہلو سے مطلب ادا ہو گیا تو بحمد اللہ۔ ورنہ اِدھر اُدھر کمی بیشی کر کے اس کو پورا کر دیں۔ ڈکشنری مترجم کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ اس کو ہر وقت حرزِ جان بنا کر رکھنا چاہیے۔ اور کبھی اس غلط فہمی میں نہ رہنا چاہیے کہ ہم بڑے انگریزی اور اردو داں ہیں۔ کیوں کہ ممکن ہے۔ وقت پر کسی لفظ کا صحیح اور موزوں ترجمہ نہ سوجھے اور ڈکشنری دیکھنے سے کوئی ایسا نفیس لفظ ہاتھ آ جائے جو فقرے میں جان ڈال دے۔

ممتاز حسین

ترجمے کا میدان بہت ہی وسیع ہے۔ فلسفے اور مضامین سے لے کر شعر و ادب کے نازک ترین اصنافِ سخن تک کا ترجمہ ایک زبان سے دوسری زبان میں کیا جا سکتا ہے لیکن ان میں سے ہر ایک کی ہیئت دوسرے سے مختلف ہو گی۔ بظاہر ترجمے کی

www.kitaabistan.com

دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک ایسے افکار و خیالات کا ترجمہ جن کے اظہار میں احساسات کو التزاماً ذریعہ نہ بنایا گیا ہو بلکہ حتی الوسع احساسات سے آزاد ہو کر خیالات کی ترجمانی کی گئی۔ اور زبان کی تمام صلاحیتیں، منطق و استدلال میں اس پر صرف کی گئی ہوں نہ کہ حسیہ تصویروں کے ذریعہ خیالات و جذبات کے مرکبات کو ابھارنے اور احساسات کے ذریعے خیالات کو پہنچانے میں۔ فلسفہ اور سائنس وغیرہ اسی زمرے میں آتے ہیں۔

دوسری صورت ایسے افکار و خیالات کا ترجمہ ہے جن کا اظہار التزاماً احساسات کے ذریعے کیا گیا ہو اور زبان کی دولت مجرد تصورات کی ترسیل اور منطق و استدلال پر نہیں بلکہ تجربات کی مصوری اور خیالات کو محسوس کرانے کی کوشش میں صرف کی گئی ہو۔ شعر و ادب کی صنفیں اس زمرے میں آتی ہیں۔

ترجمے کے یہ دونوں میدان ایک دوسرے سے اسی طرح مختلف ہیں جس طرح فلسفہ اور شعر، گو یہ صحیح ہے کہ ان کی سرحدیں آپس میں ٹکراتی بھی ہیں لیکن یہ سنگم ایسا نہیں کہ آپ ان کی علاحدہ حیثیتوں کو محسوس نہ کر سکیں۔ جب تک ہم ترجمہ کرتے وقت اس امتیاز کو اپنے سامنے نہ رکھیں گے کامیاب مترجم نہیں بن سکتے۔ ضرورت یہ ہے کہ ہم اپنی زبان کی ساخت اور صلاحیت کو بھی سمجھیں۔ کسی زبان میں دوسری زبان کا علم و ادب اسی وقت منتقل ہو سکتا ہے جب کہ اس میں مطلوبہ خیالات کے اظہار کی صلاحیت ہو۔ اردو کی ایک علاحدہ ساخت ہے، جو دوسری زبانوں کی ساخت سے مختلف ہے۔ ترجمہ کرتے وقت لامحالہ اس بات کو ملحوظ رکھنا پڑے گا۔

یوں تو تاریخ اور تمدن کی بہت سی کتابوں کا ترجمہ اردو زبان میں ہوا ہے۔ لیکن جو صحتِ خیال، شگفتگیِ بیان اور سلاست و روانی سید علی بلگرامی کی کتاب "تمدن عرب" میں ہے وہ مشکل ہی سے اس قبیل کی دوسری کتابوں میں ہوگی۔ حال ہی میں کانٹ کی کتاب Critique of Pure Reason کا ترجمہ اردو میں پیش کیا گیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ مترجم کی تفلسفی کے مطالعے میں کافی عمیق ہے اور انھوں نے کتاب کا براہِ راست جرمن زبان سے ترجمہ بھی کیا ہے لیکن اردو ترجمہ بہ نسبت انگریزی ترجمے کے زیادہ ٹھس ہے۔ ممکن ہے اردو فلسفہ

حقائق کے اظہار کرنے سے معذور ہو یا کانٹ کا فلسفہ بذاتِ خود بہت پیچیدہ ہو لیکن مترجم اس الزام سے سبکدوش نہیں ہو سکتا کہ اس نے کانٹ کی کتاب کو ہمارے لیے کسی طرح آسان نہیں بنایا۔

اس کتاب کے مقابلے میں ایک دوسری کتاب "یوں زرتشت" لیجیے۔ یہ نتشے کی کتاب "یوں زرتشت نے کہا" کا ترجمہ ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ نہ تو نتشے کے فلسفے میں وہ فلسفیانہ عمق، موشگافیاں اور پیچیدگیاں ہیں جو کانٹ کے فلسفے میں ہیں اور نہ اس تصنیف کو خالصتاً فلسفیانہ کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس میں روایتی فلسفے کی بجائے وجدانی فلسفہ پیش کیا گیا ہے۔ جس میں فلسفے سے زیادہ شاعری کا مزا ہے، پھر بھی اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ ایک فلسفیانہ کتاب ہے۔ غالباً اس کا ترجمہ بھی براہِ راست جرمن زبان سے کیا گیا ہے۔ پھر بھی جو لوگ جرمن زبان سے واقف نہیں اور اردو کے علاوہ صرف انگریزی زبان ہی جانتے ہیں۔ اسے انگریزی کے بجائے اردو ہی میں پڑھنا پسند کرتے ہیں۔ اسلوبِ بیان بہت شاعرانہ ہے۔ جس سے مصنف کی شخصیت اجاگر ہوتی ہے۔ ویسے بھی اصل عبارت میں غالباً کوئی تصرف نہیں کیا گیا۔

علمی تراجم میں تو صحتِ خیال کے ساتھ قوتِ استدلال کا اظہار لازمی ہے لیکن ادبی تراجم میں ان کے بجائے ان احساسات کا اظہار زیادہ اہم ہے۔ جن کے ذریعہ خیالات ادا کیے گئے ہیں گو قوتِ استدلال کا اظہار یہاں بھی درکار ہوتا ہے لیکن اس کی اپیل مختلف ہوتی ہے۔ یہ صرف دماغ ہی کو اپیل نہیں کرتی بلکہ انسان کے تمام قوائے احساس کو اپیل کرتی ہے۔ جن میں احساسِ جمال، احساسِ صورت اور صوت و نغمہ بھی شامل ہیں۔ اسی لیے شاعری میں جو ادب کی ایک مخصوص صنف ہے الفاظ کی اہمیت صرف معنوی نہیں بلکہ صوتی بھی ہوتی ہے۔ اس میں اظہارِ خیال ہمیشہ احساس کے ذریعے ہوتا ہے۔ اس لیے ایک زبان کے شعر کو دوسری زبان میں منتقل کرنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ شعر کا ترجمہ صرف ایک شاعر ہی کر سکتا ہے وہ بھی اس وقت جب کہ وہ اصل خیال کو اپنے احساسات سے گزارے اور یہ طریقہ کار تقریباً نیم تخلیقی ہو جاتا ہے کیوں کہ احساسات داخلی ہوتے ہیں۔ اور تمام وسعتوں اور گہرائیوں کے ساتھ دوسرے کے جسد میں منتقل نہیں ہو سکتے۔ دوسروں کے احساسات پر اتنا قابو حاصل نہیں

کیا جا سکتا جتنا ان کے خیالات پر اس حسن و خوبی کے ساتھ فارسی کے بہت سے اشعار کا ترجمہ اردو میں ہوا ہے۔ یہ خوبی انگریزی نظموں کے تراجم میں بہت کم نظر آتی ہے۔ شاید اس لیے کہ انگریزی کے برعکس اردو اور فارسی میں نہ صرف بہت سے الفاظ بلکہ بحریں بھی مشترک ہیں۔ اگر اردو اس دشواری کو ایک عذر بنائے تو وہ بجز فارسی کے اور کسی زبان کی شاعری کا ترجمہ کرنے سے قاصر رہے گی۔ اس لیے میں کچھ ایسی مثالیں پیش کروں گا جہاں یہ مشکل سدِّ راہ نہیں رہی اور نہایت خوبی کے ساتھ انگریزی نظم اردو زبان میں منتقل ہوئی ہے۔ ان میں ایک طباطبائی کی "شامِ غریباں" ہے جو ولیم گرے کے مرثیے Elegy in a Churchyard کا ترجمہ ہے۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ شاعر کے خیالات میں کہیں بھی تصرف نہیں کیا گیا اور انھیں کم و بیش ان تمام تاثرات اور احساسات کی گہرائیوں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے جو اصل نظم میں ملتی ہیں۔ طباطبائی نے یہ کام کسی محیرالعقول ذہنی صفائی سے نہیں بلکہ مناسب بحر کی تلاش اور ردیف و قافیے کے انتخاب سے انجام دیا ہے۔ عنایت اللہ مرحوم نے شیکسپیر کے متعدد ڈراموں کے ترجمے کیے لیکن اس بات پر غور کیے بغیر کہ یہ ڈرامے نظم میں ہیں۔ اس لیے شیکسپیر کی روح تو درکنار وہ "چوڑی پیشانی والا" شیکسپیر بھی ان ترجموں میں نہیں ہے جو تصویروں میں نظر آجاتا ہے۔ یہی خامی "فاؤسٹ" کے واحد اردو ترجمے میں نظر آتی ہے۔ شعر کا ترجمہ شعر ہی میں ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے بعض لوگ کہیں کہ "واہ صاحب! شیکسپیر کے ڈراموں کا ترجمہ نثر میں کیوں نہیں ہو سکتا؟" اس کا جواب یہ ہے کہ شیکسپیر کے ڈراموں کا حسن متنازعہ فیہ مسائل کے حل میں نہیں بلکہ عقل و جذبات، انانیت اور سوداگری کی اس تہ در تہ رقابت اور تصادم میں ہے جس کا شعور صرف کنارِ ذہن نہیں بلکہ دل کی گہرائیوں میں ہوتا ہے۔ اس شعور کی ترجمانی عنایت اللہ کے کسی ڈرامے میں نہیں اس کے لیے شاعرانہ ترددِ کار ہے۔ جو ان کے یہاں مفقود ہے۔ افسوس ہے کہ اردو کی شعری زبان کافی گرانمایہ ہونے کے باوجود اس میں مغربی نظموں اور ڈراموں کے ترجمے اچھے نہیں ہوئے۔ اس کام کی طرف وہ لوگ متوجہ ہوتے ہیں جنھیں شعری زبان پر خاطر خواہ دسترس نہیں ہوتی۔ حال ہی میں رلکے کے چند مرثیوں کا ترجمہ کیا گیا ہے ان میں شاعری تو ایک طرف رہی خیالِ محض بھی صحت کے ساتھ منتقل نہیں ہو سکا۔ اگر علامہ اقبال کی ان

نظموں کو سامنے رکھا جائے جن کو انھوں نے انگریزی زبان سے منتقل کیا ہے تو یہ بات کسی حد تک واضح ہو جاتی ہے کہ شعر کا ترجمہ صحیح معنوں میں ایک شاعر ہی کر سکتا ہے۔ یہ نظمیں سب کی سب اعلیٰ معیار پر پوری اترتی ہیں اور بعض تو اتنی مقبول ہو چکی ہیں کہ ان پر ترجمہ ہونے کا شبہ ہی نہیں گزرتا۔ ایمرسن کی ایک نظم کا منظوم ترجمہ جسے علامہ اقبال نے "رخصت اے بزمِ جہاں" کے عنوان سے پیش کیا اتنا حسین ہے کہ اسے مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس ترجمے کی خوبی یہی ہے کہ مترجم نے نہ صرف شاعر کے خیالات بلکہ احساسات کو بھی پیش کیا ہے اور اس کے لیے نہ صرف مناسب بحر تلاش کی ہے بلکہ حسبِ ضرورت انگریزی کی تلمیحات اور استعاروں کو اردو کی تلمیحات اور استعاروں میں بدل دیا ہے۔ نظم میں ترجمے کی دیانت داری کا یہی مفہوم ہے۔ خیالات کے ساتھ صحیح احساسات کو بھی منتقل کرنا نہ کہ لفظی ترجمہ کرنا اور ایسے غیر مانوس الفاظ کو دیانت داری کے ماتحت جگہ دینا جن سے احساسات کی ترسیل بالکل ختم ہو جائے لیکن یہ سمجھنا کہ اس کام کا نباہ صرف علامہ اقبال جیسے بڑے شاعر ہی سے ہو سکتا ہے صحیح نہیں۔ ہر وہ شخص یہ کام سرانجام دے سکتا ہے۔ جو مناسب ذوقِ شعری سے بہرہ ور ہو جسے الفاظ کے انتخاب پر دسترس ہو اور جس میں یہ صلاحیت ہو کہ وہ دوسروں کے احساسات کو اپنے نفس پر اس طرح وارد کرے کہ انھیں اپنی زبان میں گنگنانے پر مجبور ہو جائے۔ مخدوم محی الدین نے قازقستانی شاعر جابر جمبول کی نظم "استالین" کا بہت عمدہ ترجمہ کیا ہے۔ اور وہ بھی اصل کے بجائے انگریزی ترجمے سے پھر بھی یہ اصلی نظم کے حسن سے زیادہ قریب ہے۔ اس کی خوبی الفاظ اور تراکیب کے مرادفات تلاش کرنے میں نہیں بلکہ نظم کی روح، جذباتی اور نغماتی اتار چڑھاؤ اور دیگر عناصر کا صحیح عکس پیش کرنے میں ہے۔ ترجمہ ایک سالماتی فکر۔ ایک نہ ٹوٹنے والے جذباتی گھیرے سے اسی طرح ابھرا ہے جس طرح بیج سے پودا، یہ حسن اس لیے بھی پیدا ہوا کہ مترجم اصل مصنف کے خیالات اور احساسات میں بدرجۂ اتم شریک ہو گیا۔

گذشتہ پندرہ بیس سال کے عرصے میں اردو زبان میں بے شمار افسانے لکھے گئے۔ جن میں سے کچھ درحقیقت ترجمہ ہیں۔ مترجمہ افسانوں میں خواجہ غلام السیدین کا ایک

ترجمہ "آخری سبق" خاص لطف رکھتا ہے یہ موپساں کے ایک افسانے کا ترجمہ ہے۔ اس ترجمہ میں اردو زبان اصل کے تاثر کو منتقل کرنے میں کہیں حائل نہیں ہوئی بلکہ امر کی قوت کو لفظ بہ لفظ اور سطر بہ سطر ترجمہ کے بجائے ایک مخصوص جذبہ کی ترجمانی پر صرف کیا گیا ہے۔

ناول کا کینوس اتنا وسیع ہوتا ہے اور صفحات اتنے زیادہ کہ مترجم کے لیے جذبات کو ایک ہی سطح پر اپنے سینے میں بھائے رکھنا کا موقع نہیں ملتا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ناولوں کے اچھے ترجمے ہماری زبان میں کم ہیں۔ ایک تو معیاری ناولوں کے ترجمے ہی کم ہوئے اور جو ہوئے بھی ہیں ان میں سے بہت کم معیاری ہیں اختر حسین رائے پوری کے ترجمے "پیاری زمین" میں ایک خاص خوبی ہے۔ مترجم نے پرل بک کے خیالات اور احساسات کو اپنی زبان میں اس طرح منتقل کیا ہے۔ جیسے وہ خود لکھ رہے ہوں نہ اس طرح جیسے کسی قانونی مسودے یا مقدس کتاب کا ترجمہ کیا جاتا ہے گذشتہ سالوں میں "اور ڈان بہتا رہا"، "ماں"، "آزادی کی راہ"، "شیکسپیر کے قصے"، "آخری سلام" اور "مادام بوویری" بھی سامنے آئے ہیں۔ ان میں سید مطلبی، سردار جعفری اور حسن عسکری کے ترجمے کافی اچھے ہیں سید صاحب کے ترجمے میں روانی اور بہاؤ نہیں، "مادام بوویری" کے ابتدائی صفحات بہت ناقص ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے انگریزی یا فرانسیسی صرف و نحو کو بدلنے کی کوشش نہیں کی گئی۔

شمس الرحمٰن فاروقی

دریافت اور بازیافت

ترجمے کے بارے میں سوالات اور مسائل کا گہرا تعلق زبان کی اصل اور نوعیت کے بارے میں سوالات سے ہے۔ اگر کوئی ایسی واحد قدیمی زبان نہیں تھی جسے ہم ام الالسنہ کہہ سکیں، اور اگر ہر زبان اپنی جگہ بے عدیل و بے نظیر ہے، تب تو ترجمہ ناممکن ہے۔ چونکہ ایک زبان سے دوسری زبان میں کسی نہ کسی طرح کا ترجمہ ممکن ہے، اس لیے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ کبھی کوئی قدیمی، آفاقی ام الالسنہ تھی جس نے اپنے نشان بعد کی تمام زبانوں میں چھوڑے ہیں، اور اسی باعث یہ ممکن ہوسکا کہ انسان اپنے تجربات کو دوسروں تک پہنچا سکتے ہیں، اور اپنے خیالات کی ترسیل دوسروں تک کر سکتے ہیں۔ چامسکی Chomsky اسی نظریے کا موید معلوم ہوتا ہے۔ شاید اس لیے کہ اس نظریے کی رو سے کسی آفاقی تبدلاتی Transformational گرامر کے وجود کا بھی امکان پیدا ہوتا ہے۔ چامسکی کہتا ہے کہ "انسانی دماغوں میں ایک نظام قواعد مشترک ہے اور یہی نظام قواعد ہمارے لیے یہ بات ممکن بناتا ہے کہ ہم لامتناہی پھیلاؤ کے اندر واقع ہونے والے فقروں کو اپنے اندر وصول کرنے Process اور ان کی تعبیر کرنے میں کامیاب ہو سکیں۔"

چامسکی کے بہت سے تصورات کی مخالفت گذشتہ چند برسوں میں ہوئی ہے لیکن اس کے

---

۱ شمس الرحمٰن فاروقی نے یہ مضمون ساہتیہ اکیڈمی کے ترجمہ ورکشاپ (جنوری ۱۹۸۷ء) کے لیے انگریزی میں لکھا تھا۔ انگریزی میں کئی جگہ اشاعت کے علاوہ اس کے ہندی اور تامل تراجم بھی شائع ہو کر مقبول ہوئے ہیں۔ فاروقی صاحب نے اپنے انگریزی مضمون کو خود ہی اردو میں منتقل کیا ہے۔

اس سوال کو کوئی اطمینان بخش جواب نہیں مل سکا ہے کہ انسان بولتا کیوں ہے؟ کیا انسان اس لیے بولتا ہے کہ اس کے حلق اور گلے میں خاص طرح کے عضلات اور ہڈیاں ہیں جو آواز نکالنے میں معاون ہیں، یا انسان کے حلق اور گلے میں خاص طرح کے عضلات اور ہڈیاں اس لیے ہیں کہ وہ بول سکتا ہے؟ یہ معاملہ صرف اس بات کا نہیں ہے کہ فوقیت کس کو حاصل ہے؛ بدنیات کو یا حیاتیات کو؟ کیوں کہ اگر انسان اس لیے بولتا ہے کہ اس کا گلا ایک خاص طرح کا ہے تو پھر زبان ایک محض بدنیاتی معاملہ ہے اور یہ محض انسانوں کی کوئی بلاشرکت غیرے جاگیر نہیں۔ لیکن اگر انسان نے لاکھوں برس میں ایسا گلا ارتقائی طور پر حاصل کیا جس کے ذریعہ آوازیں نکل سکیں، کیوں کہ انسان بولنا چاہتا تھا۔ تب تو زبان بدنیاتی نہیں بلکہ داخلی اور حیاتیاتی معاملہ ہے۔ اور اگر ایسا ہے تو کسی ایسی زبان کا وجود تصور کرنا مشکل نہیں جسے کسی گم نام، قدیم زمانے میں تمام انسان بولتے تھے۔ اس نظریے کی رو سے انسان کے لیے زبان فطری اور داخلی قوت ہے۔ اور اس کی وہی حیثیت ہے جو موسیقی، ڈرائنگ اور منطق کی ہے۔

لیکن مشکل یہ ہے کہ موسیقی، ڈرائنگ اور منطق کو سمجھنے کے لیے ان کا ترجمہ ضروری نہیں لیکن زبان تو علامیوں Codes کے ذریعہ اپنا عمل کرتی ہے اور ان علامیوں Codes کو کھولنا Decode کرنا ہر سطح پر ضروری ہوتا ہے۔ رومان یاکبسن کہتا ہے کہ علامیہ کھولنے To decode کا یہ عمل اس وقت بھی ہوتا ہے جب علامیے کا مخاطب ایسا شخص ہو جو اس زبان کو نہ صرف جانتا ہو، بلکہ وہ زبان اس کی مادری زبان بھی ہو۔ کیوں کہ علامیے کی فطرت ہی ایسی ہے کہ وہ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اسے کھولا جائے (یعنی Decode کیا جائے)، اگر ایسا ہے تب تو ہم تمام زندگی ترجمہ ہی کرتے رہتے ہیں، حتیٰ کہ اپنی زبان میں گفتگو کرتے وقت بھی ہم ترجمہ ہی کر رہے ہوتے ہیں۔ لہٰذا ترجمہ ایسا عمل ہے۔ جو ضروری بھی ہے اور پسندیدہ بھی۔ جب دو اشخاص کے درمیان علامیے مشترک ہوں تو مشکل نہیں ہوتی۔ بلکہ یوں کہیے کہ ہوتی ہے، مگر بہت کم، اتنی نہیں ہوتی کہ بات سمجھ میں نہ آئے۔ اصل مشکل تب پیدا ہوتی ہے جب گفتگو کرنے والوں کے درمیان علامیہ مشترک نہیں ہوتا۔ مثلاً جب ہمارا سابقہ ایسی زبان سے پڑتا ہے جس سے ہم نابلد ہوں۔ ایسی صورت میں اجنبی زبان کے علامیوں کو سیکھنا اور ان اجنبی علامیوں کو اپنے مانوس

علامیوں میں منتقل کرنا پڑ جاتا ہے۔

علامیوں کو اس طرح منتقل کرنے میں ان کے معنی کا کتنا حصہ ضائع ہو جاتا ہے۔ مثالی صورت حال کی رو سے تو یہ ہونا چاہیے کہ کچھ بھی ضائع نہ ہو خاص کر اگر تمام زبانوں کی ماں ایک ہی زبان ہے۔ لیکن حقیقی صورت حال یہ ہے کہ بہت کچھ ضائع ہو جاتا ہے۔ کیفیت کے اعتبار سے بھی اور کمیت کے اعتبار سے بھی۔ بلکہ یوں کہیے کہ کیفیت کے اعتبار سے نقصان اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ یہ کہنا مشکل ہے کہ نقصان کی نوعیت محض کمیت سے متعلق ہوتی ہے۔ اس معاملے پر آئندہ بحث ہوگی۔ فی الحال تو زبان کی نوعیت کے بارے میں ایک دو باتیں اور ہو جائیں۔

چامسکی کے مخالف نظریاتِ لسان میں ایک نظریہ یوں ہے کہ زبان دراصل تہذیب سے محض ہے۔ بعض لوگ تو یہاں تک کہہ دیں گے کہ تہذیب ہی زبان سے محض ہے۔ یعنی اگر زبان مجموعہ ہے حیات و کائنات کے بارے میں بیانات کا، تو تہذیب ان بیانات کی عملی صورت یا ان کا عملی پہلو ہے۔ اس طرح معلوم ہوا کہ تہذیب کچھ نہیں ہے، وہ محض زبان کی اولاد ہے۔

جارج اسٹائنر George Stainer کا نظریہ تقریباً یہی ہے جب وہ کہتا ہے (یعنی "روٹی" کے لیے انگریزی لفظ) کو Pain (یعنی "روٹی" کے لیے فرانسیسی لفظ) کا ترجمہ نہیں کہہ سکتے۔ فرانسیسی کانوں کو لفظ Pain میں احتیاج اور پرجوش مطالبے کی وہ گونج سنائی دیتی ہے جو انگریزی لفظ میں ہے ہی نہیں۔ لہٰذا اس نظریے کی رو سے یہ ہم نہیں ہیں جو کوئی نظریۂ حیات و زندگی وضع کرتے ہیں اور پھر اسے زبان کے ذریعہ ظاہر کرتے ہیں۔ بلکہ یہ زبان ہے جو ہمارے نظریۂ حیات و زندگی کو وضع کرتی ہے۔ یہاں ہم ارسطو کے اس خیال کے بہت قریب پہنچ جاتے ہیں کہ کسی چیز کو نام دینا اور اس کو بیان کرنا ہی اس شے کا علم حاصل کرنا ہے۔ یعنی جب آپ نے کسی شے کو نام دے دیا اور اس کو بیان کر دیا، تو اس کا علم آپ کو حاصل ہو گیا۔ یہ تصور تمام قدیم فلسفوں اور قبل قدیم اعتقادات میں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔ پرانے تصورات کی رو سے لفظ اور شے ایک ہی تھے۔

رچرڈ رارٹی Richard Rorty نے نطشہ اور نلسن گڈمین کے خیالات سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے حالیہ خیال انگیز مضامین کے سلسلے میں اس بات سے بحث کی ہے کہ خود ی

Selfhood اور لسان دونوں ہی وجوب سے معرا ہیں۔ رارٹی کا کہنا ہے کہ حقائق (یا حقیقت)، چونکہ زبان کے ذریعہ ظاہر کیے جاتے ہیں۔ اور زبان انسان کی بنائی ہوئی ہے۔ اس لیے حقائق (یا حقیقت)، بھی انسان کے بنائے ہوئے ہیں۔ یہ تصور ترجمے کے لیے پیغام موت کا حکم رکھتا ہے کیوں کہ اگر تمام سچائیاں انسان کی بنائی ہوئی اور وجوب سے عاری ہیں تو ایسی کوئی آفاقی حقیقت نہیں جسے ہم جان سکیں۔ اور جس کا ترجمہ کر سکیں۔ تمام تراجم کو یہ خطرہ لاحق ہے کہ وہ محض ہماری سچائیوں کی تخلیق نو ہیں اور ان میں کوئی بھی اصلیت نہیں۔

لیکن اگر ہم رارٹی کے اس تصور کو مسترد بھی کر دیں کہ زبان وجوب سے عاری ہے تو بھی ہم ان مسائل کو حل کرنے سے بہت دور رہیں گے جو زبان کے تفاعل کے بارے میں آج کے مقبول نظریات کے ذریعہ پیدا ہوتے ہیں۔ سی۔ ایس پیئرس اور فرڈنیاں سوسیور Ferdinand Sanssure کی تحریرات اس صدی کے شروع میں منظر عام پر آئیں۔ اور آج تو سوسیور کی لسانیات اس زمانے کا برحق نظریۂ لسان بن گئی ہے ایڈورڈ سعید نے اپنی کتاب The World, The Text and the Critic میں کہا ہے کہ لسان کے عدم وجوب کا نظریہ سب سے پہلے اسپینی، عرب فلسفی ابن حزم نے پیش کیا۔ ان تمام خیالات کے نتیجے میں یہ مشکل پیدا ہوتی ہے کہ اگر زبان مطلق حقائق کا گہوارہ نہیں ہے، تب ہم دنیا کے بارے میں علم صرف منفی اصطلاحات کے ذریعہ حاصل کر سکتے ہیں، اور یہ منفی اصطلاحات بھی انسان کی بنائی ہوئی ہیں۔

ترجمے سے ان معاملات کا تعلق ظاہر ہے۔ اگر معنی الفاظ کے اندر اصلی وجود نہیں رکھتے، بلکہ محض الل ٹپ ہیں تو کیا ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ کسی فن پارے میں مرادِ شاعر کیا تھی؟ کیا ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ شاعر کے معاصرین نے اس کے کلام سے کیا مراد لی تھی؟ اور اگر ہم شاعر کی مراد کو سمجھنے میں کامیاب بھی ہو جائیں تو کیا یہ ضروری ہے کہ اس کا مفہوم ہمارے لیے بھی معنی خیز ہو؟ اگر نہیں تو کیا جب ہم کسی فن پارے کا ترجمہ اپنی فہم کے اعتبار سے کرتے ہیں تو کیا ہم اس فن پارے پر اپنے معنی مسلط نہیں کر رہے ہیں؟ شاید اسی لیے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ترجمہ محض ترجمہ نہیں، بلکہ ترجمہ شدہ فن پارے کی عمدہ تنقید بھی ہوتا

ہے اور فرض کیجیے کہ ہم مرادِ شاعر کو سمجھ گئے اور مرادِ شاعر ہمارے لیے بامعنی بھی ہے، تو اب ہم کیا کریں؟ مثال کے طور پر پرانے یونانیوں کا خیال تھا کہ نظر یا بصارت روشنی کی باریک لکیریں ہیں جو آنکھ سے نکل کر اشیاء پر پڑتی ہیں اور اس طرح اشیاء ہمیں دکھائی دیتی ہیں۔ یونانیوں کے اس نظریے کی بنا پر فارسی، عربی، ترکی، اردو وغیرہ میں "تیرِ نگاہ" قسم کے صدہا استعارے وجود میں آئے۔ اس تصور کی وجہ سے شعرا کے لیے یہ ممکن ہوا کہ وہ بصارت کو کسی طبیعی قوت کی طرح کا فرض کر سکیں۔ پھر معشوق کی نگاہ کے لیے خنجر، تلوار، تیر وغیرہ استعارے ممکن ہو سکے۔ مصری سائنس داں ابن الہیثم نے دسویں صدی میں دریافت کیا کہ روشنی آنکھ سے نکل کر اشیاء پر نہیں پڑتی۔ بلکہ وہ روشنی جو اشیاء پر باہر سے پڑتی ہے، اس کے ذریعہ آنکھ کے پردے پر تصویریں بنتی ہیں۔ ابن الہیثم کے تصورات کی وجہ سے اس طرح کے مضامین وجود میں آئے کہ دیکھی ہوئی شے کا نقش (یا عکس)، آنکھ پر ہمیشہ کے لیے مرتسم ہو جاتا ہے۔ اب اگر آپ انگریزی میں ترجمہ کر رہے ہیں تو اس طرح کے استعاروں کو کس طرح ادا کریں گے کہ نگاہیں تیر ہیں، یا یہ کہ آنکھ کی سطح پر کسی شے کا نقش ہمیشہ کے لیے کالجر ہو گیا ہے؟ آپ جو بھی کریں، لیکن اصل بیان کی کچھ نہ کچھ سچائی ترجمے میں ضرور ضائع ہو جائے گی۔

کہا گیا ہے کہ چونکہ تمام زبان ہی الل ٹپ ہے، اس لیے تمام زبان استعارہ ہے لہٰذا مترجم کو چاہیے کہ لفظ بہ لفظ ترجمے کے بجائے استعارہ بہ استعارہ ترجمہ کرے۔ لیکن یہ استدلال دوری ہے کیونکہ اگر تمام زبان استعارہ ہے تو الفاظ سے الگ استعارہ کوئی چیز نہیں۔ لیکن چلیے تھوڑی دیر کے لیے اس استدلال کو تسلیم کر لیتے ہیں کہ مترجم کو چاہیے کہ استعارہ بہ استعارہ ترجمہ کرے۔ استعارے کی بنیاد یہ ہے کہ مماثلت کی بنا پر معنی میں توسیع ہو۔ اور مماثلت کا تصور پیدا ہوتا ہے ہمارے تصورِ حیات و زندگی سے۔ اور ہمارا تصورِ حیات و زندگی اگر زبان کا پروردہ نہیں بھی ہے تو زبان سے متاثر ضرور ہوتا ہے۔ سی۔ ایس۔ پیئرس نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "لفظ 'کتا' کسی کو نہیں کاٹتا۔" لہٰذا کتے اور خونخواری میں مماثلت اس وجہ سے نہیں ہے کہ لفظ 'کتا' میں کوئی خاص کتا پن ہے۔ یہ مماثلت اس وجہ سے ہے کہ ہمارے نظریۂ حیات و زندگی کی رو سے کتے خوں خوار ہوتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی تہذیب ایسی ہو جس

ہیں کتے کو معصوم اور مقدس مانا جاتا ہو تو کتے اور خوں خواری کی مماثلت غالب ہو جاتی ہے فرض کیجیے ایسی کسی تہذیب میں کوئی مترجم آڈن Auden کی ایک نظم کا ترجمہ کر رہا ہے جس میں یہ دو سطریں ہیں۔

In the Nightmare of the Dark
All the Dogs of Europe Bark

تو ایسی تہذیب والے کے لیے یہ مصرعے مفہوم سے عاری ہوں گے۔ لہٰذا اس کے ترجمے میں Dogs کی جگہ کوئی اور جانور رکھنا پڑے گا، مثلاً بھیڑیا، لکڑ بگھا۔ لیکن فرض کیجیے کہ ہمارے مترجم کی تہذیب میں بھیڑیے اور لکڑ بگھے کا وجود نہیں۔ وہ سوچ سمجھ کر ان کا نزدیکی درندہ "شیر" اپنے ترجمے میں لکھ دیتا ہے۔ بھیڑیے یا لکڑ بگھے کا لفظ رکھنے کے بعد اسے لفظ Bark کے لیے بھی کوئی دوسرا لفظ رکھنا پڑتا۔ لیکن لفظ شیر کا انتخاب کر کے وہ دوہری مشکل میں پڑے گا۔ اسے لفظ Bark کی جگہ کوئی اور لفظ تو رکھنا ہی ہوگا لیکن "شیر" کہہ کر وہ مراد شاعر سے بہت دور بھی جا پڑے گا، کیوں کہ آڈن انگریزی شاعر ہے اور یورپ میں شیر ہوتے ہی نہیں۔ لہٰذا "یورپ کے شیر" اتنا ہی بے معنی ہے جتنا "ہندوستانی زیبرا" یا "خطۂ شمالی کا مور"۔ پھر مصیبت یہ ہے کہ بھونکتے ہوئے کتوں کے پیکر میں بہت سے انسانی، گھریلو انسلاکات بھی ہیں۔ جہاں آپ نے لفظ Bark کو ترک کیا، وہ انسلاکات بھی ترک ہو جائیں گے۔ اور ترجمہ ناقص رہ جائے گا۔

لہٰذا ایسا لگتا ہے کہ دونوں طرح مترجم کی شکست ہی بدی ہے۔ اگر لفظ بہ لفظ ترجمہ سہل ہو سکتا ہے تو غیر لفظی یا استعاراتی یا تخلیقی ترجمہ بھی اسی خطرے میں ہے۔

بہت سے مترجم کہتے ہیں کہ اگر ہم "اصل کی روح" کو ادا کر دیں تو ہم نے اپنا کام کر لیا کیوں کہ الفاظ تو بہرحال ناقابل ترجمہ ہیں۔ یا اگر ان کا ترجمہ ہو بھی جائے تو وہ اصل کے ساتھ انصاف نہیں کرتے۔ یہاں میں اس بات سے بحث نہ کروں گا کہ کیا مترجم بلکہ کسی بھی شخص میں یہ صلاحیت ہوتی بھی ہے کہ وہ اصل کی روح کے بارے میں صحیح صحیح بیان کر سکے کہ وہ کیا ہے۔ لیکن میں یہ سوال ضرور پوچھوں گا کہ کیا اصل الفاظ کے علاوہ اور بھی کوئی الفاظ ہو سکتے ہیں جو اصل کی روح کو بیان کر سکیں۔ مثلاً "نگاہوں کے تیر" اس فقرے کی روح کو بیان کرنے کے لیے

کون سے الفاظ یا کون سی عبارت کافی ہوگی۔ اقبال کا مصرع ہے۔ ع

اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دل نشیں

یہاں "دل نشیں" کے لغوی معنی ہیں "دل میں بیٹھا ہوا، دل میں گڑا ہوا، دل میں بیٹھنے یا گڑنے کی صلاحیت رکھنے والا" اس کے مجازی معنی ہیں "دل کو کھینچنے والا، دل کو متاثر کرنے والا"۔ اب "نگاہوں کے تیر" کی مناسبت سے "دل نشیں" کے لغوی معنی ترجمے میں زیادہ بہتر معلوم ہوں گے اور اس فقرے کا لغوی ترجمہ "اصل کی روح" سے نزدیک تر معلوم ہوگا۔ پھر اس قاعدے کا کیا بنا کہ مترجم کو چاہیے کہ وہ لغوی معنی کو نظر انداز کر کے "اصل کی روح" کو اپنی گرفت میں لائے۔ اکثر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لغوی معنی ہی میں اصل کی روح پوشیدہ ہے۔

وکٹر کیرنن Victor Kiernan نے اقبال کے محولہ بالا مصرعے کا ترجمہ یوں کیا ہے۔

Barb Those Glances whose Barbs Sticks
in the Heart Where They Fall

ظاہر ہے کہ اس ترجمے میں "دل نشیں" کے دونوں معنی (لغوی اور استعاراتی) مفقود ہیں پھر ترجمے کے آخری تین لفظ Where They Fall نہ صرف بالکل نامناسب ہیں، بلکہ تکرار ناروا کی بھی مثال ہیں۔ مترجم نے یہ فقرہ وزن کو پورا کرنے کے لیے اور شاید انگریزی میں Barb of Glances کی تقریباً بے معنویت کو نرم کرنے کے لیے مصرعے میں داخل کیا ہے۔ پھر یہ بھی غور کیجیے کہ اردو کا مصرع اپنی جگہ پر مکمل ہے۔ مترجم نے اس کی ہیئت کو بدل کر مصرع میں تکمیلیت کے احساس کو بھی نقصان پہنچا دیا ہے۔

مزید مسئلہ یہ ہے کہ مترجم کی ذاتی ترجیحات، اصل زبان اور ترجمے والی زبان کے لیے اس کا جبلی اور باطنی احساس، اور جس مصنف کا ترجمہ وہ کر رہا ہے، اس کے پورے کلام کے بارے میں مترجم کا تاثر، یہ سب باتیں مختلف طرح سے ترجمے پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اسٹینلی

برن شائے اپنی کتاب Varieties of Literary Experience کے دیباچے میں اس کی بڑی موثر مثال فراہم کی ہے، ٹوماس مان کے طویل افسانے "ٹونیو کروگر" کا محض ایک سادہ سا جملہ وہ ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ اصل جرمن زبان سے اس کو حسب ذیل طریقوں سے انگریزی میں منتقل کیا گیا ہے۔

بی۔ کیو۔ مارگن : And Tonio Kroger Journeyed Northward

کنتھ برک : And Tonio Kroger Travelled North

ایچ ٹی۔ لو۔ پورٹر : And Tonio Kroger Travelled Northh

خود مان کا منظور شدہ ترجمہ : And Tonio Kroger Went North

بعض لوگ کہہ سکتے ہیں کہ آخری شکل، جسے خود اصل مصنف کی منظوری حاصل ہے، سب سے زیادہ کمزور ہے تو کیا بطور مترجم ہم یہ حق رکھتے ہیں کہ مصنف کی ترجیح اور منظوری کو نظر انداز کر دیں اور اس طرح ترجمہ کریں جس طرح ہم مناسب سمجھتے ہیں؟

میں نے اوپر کہا ہے کہ زبان میں کوئی چیز درحقیقت کیمت کی حامل نہیں ہوتی۔ بلکہ ہر چیز کیفیت کا حکم رکھتی ہے۔ ترجمے میں اصل کا جو کچھ چھوٹ جاتا ہے۔ وہ بھی اتنی ہی کیفیت کا حامل ہوتا ہے۔ جتنا وہ حصہ جو اصل سے ترجمے میں پہنچتا ہے۔ کوئی ضروری نہیں کہ ہم رابرٹ فراسٹ کی طرح یہ کہیں کہ شاعری وہ ہے۔ جو ترجمے میں حذف ہو جاتی ہے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ ترجمہ دراصل قربانیوں اور مفاہمتوں کا سلسلہ ہوتا ہے۔ جب ہم شاعری کا ترجمہ کرتے ہیں تو وزن و بحر، شعر کی ظاہری ہیئت، قافیہ، مختلف طرح کے بصری علامیے، روزمرہ اور محاورہ کے وہ حصے جو اصل زبان کے باہر بے معنی ہو جاتے ہیں۔ الفاظ کی شکل و بافت — ہمیں ان سب کو سب سے پہلے قربان کر دینا پڑتا ہے۔ ان میں سے کچھ قربانیاں لائق برداشت تو ہوتی ہیں، لیکن چونکہ مندرجہ بالا تمام کی تمام چیزیں شعر کے معنی کا حصہ ہوتی ہیں۔ اس لیے ہم جس حد تک انھیں ترک کرنے پر مجبور ہوں گے۔ اس حد تک ہم اس شعر کے اندر موجود شاعری کو بھی ترک کرنے پر مجبور ہوں گے۔ علیٰ ہذا القیاس، گرامر کا بہت سارا حصہ بھی ترجمے میں ضائع ہو جاتا ہے، اور یہ نقصان بھی کیفیت کا حامل ہے

کیمت کا نہیں، ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے اردو ترجمہ قرآن کے دیباچے میں لکھا ہے کہ اور یہ بات بہت اہم ہے، اس کو بیان کرنے میں اولیت کا شرف بھی نذیر احمد کا ہے، کہ عربی گرامر کے بہت سے قاعدے اور رسوم اردو میں ناپید ہیں۔ نذیر احمد نے بیان کیا ہے کہ گرامر کے یہ قاعدے اور رسوم، متن قرآن کے کردار کو قائم کرنے میں بہت اہم ہیں، لیکن افسوس کہ اردو کا ترجمہ نگار اس نقصان کو کسی طرح پورا نہیں کر سکتا۔

یا جنس کی معمولی سی مثال لیجیے۔ انگریزی زبان میں جنس Gender کا محدود تصور ہے فارسی میں بالکل نہیں۔ اردو، ہندی، پنجابی، عربی، فرانسیسی میں جنس ہے، کسی زبان میں اس کا عمل دخل بہت زیادہ ہے۔ کسی میں نسبتاً کم۔ اب اگر کسی منظر میں انگریزی یا فارسی میں بیان کیا جائے تو یہ ممکن ہے کہ Suspense اسرار یا عدم قطعیت پیدا کرنے کی غرض سے کرداروں کی جنس کو واضح نہ کیا جائے۔ اب اگر ایسے فن پارے کو ایسی زبان میں ترجمہ کیا جائے جس میں جنس کو واضح کیے بغیر چارہ نہ ہو، تو ظاہر ہے کہ بیانیہ کی وہ ترکیب جو اصل مصنف نے استعمال کی ہے۔ بروے کار نہ آ سکے گی۔ مثلاً انگریزی کا جملہ Sparky Came اس سے بالکل پتہ نہیں لگتا کہ Sparky عورت ہے یا مرد۔ لیکن اردو میں ہمیں کہنا ہوگا "اسپارکی آیا" یا "اسپارکی آئی" اور اس طرح اسپارکی فوراً مرد یا عورت ثابت ہو جاتی ہے۔ لہٰذا وہ Suspense یا اسرار قائم نہیں ہو سکتا جو اصل مصنف کا مقصود تھا۔ دوسری طرف یہ بھی ہے کہ جنس کا التزام رکھنے والی زبان کے مصنف کو بہت سے ایسے جدلیاتی رویے اور جذبات انگیز طریقے بہم ہوتے ہیں جو اس زبان میں نہیں ہوتے جس میں جنس کا التزام نہیں ہوتا مثلاً اردو میں ہم کہتے ہیں۔ میرا محبوب آیا/میری محبوبہ آئی۔ انگریزی میں دونوں صورتوں کے لیے ایک ہی عبارت ہوگی۔ "My Beloved Came" اس جملے کا اردو سے انگریزی میں ترجمہ بہرحال ناقص ہوگا۔ پھر یوں بھی ہے کہ اردو میں مذکر لکھ کر مونث مراد لیتے ہیں۔ (یعنی معشوق کو اکثر مذکر لکھتے ہیں)، اور اس طرح کثیر المعنویت حاصل ہوتی ہے۔ جس زبان میں مذکر مونث نہ ہو اس میں اس طرح کی کثیر المعنویت ممکن نہیں۔

ان سب نقصانات کے باوجود ترجمہ تو بہرحال ہونا ہی چاہیے۔ سچ تو یہ ہے کہ کبھی کبھی ترجمے کو ان سے بھی زیادہ نقصانات اٹھانے پڑتے ہیں، اور کبھی کبھی شکست تسلیم کرنی پڑتی ہے۔ بیکٹ کے ڈرامے Waiting for Codor کا ترجمہ کرتے وقت کرشن چندر نے عجب غیر معمولی کارنامہ انجام دیا کہ پوتو Pozzo کے بے معنی مکالمات کا ترجمہ انھوں نے لغوی طور پر کرنے کے بجائے اپنے طور پر بے معنی عبارت لکھ دی اور اصل کا تاثر بھی قائم رکھا۔ یعنی انھوں نے لفظ اور فقرے کی جگہ تاثر اور تاثیر کا لحاظ رکھا لیکن ایسا ہر بار ممکن نہیں ہو سکتا۔ مثلاً شیکسپیر کے ڈرامے King Lear میں بادشاہ لیئر کی مجذوبانہ بڑ یا اسی ڈرامے میں مسخرے کی بے معنی گفتگو کا ترجمہ کرنے کے لیے کرشن چندر والی ترکیب کارگر نہ ہوگی۔ کیوں کہ ان عبارتوں میں رعایتِ لفظی، ابہام اور تلمیح کی کثرت ہے۔ بادشاہ کی مخبوط الحواسی اور مسخرے کے اہمال میں شیکسپیر نے بہت سی باریکیاں پوشیدہ کر رکھی ہیں۔

کامیاب ترجمہ وہ ہے جو اصل کے مطابق ہو یا بڑی حد تک اصل کے مطابق ہو، اور خلاقانہ شان رکھتا ہو۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں باتوں کا یک جا ہونا تقریباً ناممکن ہے۔ لیکن ترجمے میں کامیابی کا تصور بہت وسیع ہے۔ اور اگرچہ کوئی بھی شخص اس کامیابی کی پوری وسعت کا احاطہ نہیں کر سکتا، اچھے اور خوش نصیب مترجم اس کے بڑے حصے کا احاطہ ضرور کر سکتے ہیں کامیاب ترجمہ اس معنی میں خلاقانہ نہیں ہوتا کہ مترجم اصل کی جگہ اس کے برابر کوئی دوسری نظم یا ناول لکھ دیتا ہے۔ مترجم اصل فن پارے کو اپنی زبان میں دوبارہ خلق کرتا ہے، اور اس طرح نہیں کہ پہلے وہ اصل فن پارے کو مار ڈالے اور پھر اسی کو اپنی زبان میں دوبارہ زندہ کرے۔ اور نہ اسے یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ وہ خود اصل فن پارے کا مصنف ہے اور اب اس فن پارے کو وہ ترجمے والی زبان میں لکھ رہا ہے۔ سافکلیز کا ترجمہ کرتے وقت ازرا پاؤنڈ نے یونانی دیہاتی لوگوں کو لندن کی کاکنی Cockney زبان بولتے ہوئے دکھایا ہے۔ اس سے انگریزیت تو ترجمے میں آ گئی، لیکن یونانیت غائب ہو گئی۔ یہ بات صحیح ہے کہ بقول ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ یہ بڑی غلطی ہوگی کہ ہم ازرا پاؤنڈ کے تراجم کو اس کے طبع زاد کلام

سے الگ کر کے دیکھیں۔ لیکن ایلیٹ کے اس جملے کا اطلاق ازرا پاؤنڈ کے ان ترجموں پر زیادہ ہوتا ہے جو اس نے غیر زبانوں کی شاعری اور خاص کر چینی اور لاطینی شاعری کے لیے ہیں ولیم ایرو اسمتھ William Arrowsmith نے یونانی طربیہ نگار Aristophanes کے جو تراجم کیے ہیں، ان میں یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے۔ ایرو اسمتھ کے تراجم میں یونانی عوام اور دیہاتی لوگ ایسی زبان تو بولتے ہیں جو طربیہ مضمون اور لہجے کے لیے مناسب ہے لیکن وہ "عوامی" یا "دیہاتی" زبان نہیں بولتے۔ اس طرح ایرو اسمتھ اصل ڈرامے اور ہمارے درمیان ضروری فاصلہ قائم کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ خلاقانہ ترجمہ وہ ہے جو اصل فن پارے کی شخصیت کو منہدم نہیں کرتا، اور ترجمے والی زبان میں پہلے سے موجود ادب سے مختلف معلوم ہوتا ہے۔ لیکن مختلف معلوم ہوتے ہوئے بھی وہ ترجمے والی زبان بولنے والوں کے لیے قابلِ قبول اور قابلِ فہم ہوتا ہے۔

لہٰذا یہ کہنا غلط ہے کہ ترجمہ کیے ہوئے فن پارے کو ترجمہ نہیں معلوم ہونا چاہیے۔ محمد حسن عسکری، جنھوں نے خود فرانسیسی اور انگریزی سے بہت عمدہ تراجم کیے ہیں، کہا کرتے تھے کہ ترجمے میں "ترجمہ پن" کا ہونا کوئی عیب نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ترجمے کے ذریعے ترجمے والی زبان کے نئے امکانات منکشف ہوتے ہیں۔ ترجمہ دراصل مترجم کو دو طرفہ جنگ میں مبتلا کرتا ہے۔ یہ جنگ اس زبان سے بھی ہوتی ہے جس سے ترجمہ کیا جا رہا ہے، اور اس زبان سے بھی جس میں ترجمہ ہو رہا ہے۔ جارج اسٹائنر Georg Steiner کہتا ہے کہ ترجمہ ایک زندہ چنگاری ہے، یہ ماخذ اور حال اور تہذیبوں کے درمیان توانائی کا بہاؤ ہے۔ وہ مزید کہتا ہے کہ اپنے وجود کی جگہ دوسرا وجود اختیار کرنے کا قریب ترین امکان اسی میں ہے کہ ہم جہاں تک ہم سے ہو سکے، خود کو کسی دوسری زبان میں غرق کر دیں۔ لیکن چونکہ ترجمہ ہمیں خود اپنی زبان کے بھی حدود اور امکانات سے روشناس کراتا ہے، اس طرح وہ بذاتِ خود تخلیق بن جاتا ہے۔

کہا گیا ہے کہ ناول کے ترجمے میں وہ مسائل نہیں پیدا ہوتے جو شاعری کے ترجمے میں ہوتے ہیں۔ اسٹینلی برن شا Stanley Burnshaw کا کہنا ہے کہ ناول کا بڑا حصہ

اور یقیناً اس کا اہم ترین حصہ ترجمے میں باقی رہتا ہے۔ رن شا کہتا ہے کہ "شاعری یقیناً وہ واحد عنصر نہیں ہے جو کسی بدیسی ناول کے انگریزی ترجمے کے مجموعی گہرے تاثر کو پیدا کرتی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ ناول میں بہت سے ایسے اجزا ہوتے ہیں جو اصل سے الگ کیے جا سکتے ہیں اور وہ ترجمے میں بخوبی آ سکتے ہیں۔ یہ بات صحیح ہے کہ فکشن کا ترجمہ شاعری کے ترجمے کے مقابلے میں آسان لگتا ہے۔ لیکن شاعری کی نوعیت ہی ایسی ہے کہ مترجم کو اس سے زیادہ کامیابی کی امید نہیں ہو سکتی جتنی اس فوٹو گرافر کو ہو سکتی ہے جو کسی رنگین تصویر کی ایک رنگی فوٹو تیار کرتا ہے۔ فکشن میں بھی بہت سی وہی تشکیلات ہوتی ہیں۔ جو شاعری اور ڈرامے میں ہوتی ہیں۔ لیکن کسی اچھے اسٹیج ڈرامے کا خراب ترجمہ بھی اسٹیج پر کامیاب ہو سکتا ہے، کیوں کہ ڈراما کی بہت سی خصوصیات موسیقی کی طرح، ترجمے کی محتاج نہیں ہوتیں۔ مگر فکشن میں لسانی تشکیلات زیادہ ہوتی ہیں، خالص ڈراما کم (اگرچہ ہنری جیمس کی تمنا یہی تھی کہ وہ ایسے ناول لکھے جس میں ڈراما کا وصف ہو) روسی اور فرانسیسی ناولوں کے جو تراجم اردو میں ہوئے ہیں (چاہے براہِ راست، چاہے براہِ انگریزی) ان میں سے اکثر میں یہی خرابی ہے کہ مترجم اصل زبان کو اپنے وجود کا حصہ بنانے اور "اندر سے کام کرنے" سے قاصر رہا ہے۔ ان تراجم میں اصل زبان زندہ تحرک انگیزی کے بجائے نمونے کا کام دیتی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہاں اصل زبان، ترجمے والی زبان کی تشکیل کے بجائے، اس سے ٹکرانے کا کام کرتی ہے۔ اور اس طرح دونوں کا زیاں ہو جاتا ہے۔ خلاقانہ ترجمے میں اصل زبان، ترجمے والی زبان کو زندگی بخشنے کا کام کرتی ہے۔

اگر ترجمہ تخلیق کا درجہ رکھتا ہے تو ہمیں Transcreation اور "آزاد ترجمہ" جیسی اصطلاحوں پر وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ سب اصطلاحیں یا تو خراب ترجموں کا پردہ ہیں، یا پھر ایسے تراجم کی حمایت کرتی ہے۔ جو اصل سے بہتر ہونے کی کوشش کرتے ہیں یا اس کی توہین کرتے ہیں۔ کوئی بھی ترجمہ اصل کے حسن و خوبی کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ کوئی فن پارہ کسی دوسرے فن پارے کے ہو بہو نہیں ہو سکتا۔ ترجمہ بذاتِ خود فن پارہ ہے، لیکن اسے ترجمہ کہلانے کا حق اسی وقت ہے جب وہ اصل کی کیفیت اور

احساس کو ممکن ترین حد تک دوبارہ خلق کر سکے۔

اگر ترجمے کا وہی مرتبہ ہے جو تخلیق کا ہے، تو کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ صرف تخلیقی فن کار ہی اچھے مترجم ہو سکتے ہیں۔ بودلیئر کا دعویٰ تھا کہ نقادوں میں سب سے اچھا نقاد شاعر ہوتا ہے۔" یہ بات بودلیئر کی حد تک تو صحیح ہے۔ کیوں کہ آج بہت سے لوگ بودلیئر کو سب سے بڑا فرانسیسی نقاد مانتے ہیں۔ لیکن خود بودلیئر نے ایڈگر ایلن پو Edger Allan Poe کے جو ترجمے کیے ہیں وہ پوری طرح سچے نہیں ہیں، اس معنی میں، کہ بودلیئر نے ترجمے کو اصل سے بڑھا دیا ہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ شاعر اور غیر شاعر، دونوں فرقوں میں اچھے مترجم بھی ہوئے ہیں اور برے بھی۔ پروست کے ترجمے کے لیے اسکاٹ مانکریف سے بہتر کوئی نہیں۔ لیکن خود اسکاٹ مانکریف Scott Moncriefe ناول نگار نہ تھا۔ ہومر کی الیڈ کا جو ترجمہ پوپ نے کیا تھا وہ بہت زندہ اور متحرک ہے۔ چیپ مین Chapman کے ترجمہ الیڈ نے کیٹس کو بہت متاثر کیا۔ لیکن نہ چیپ مین اچھا مترجم تھا نہ پوپ میکس ہے ورڈ Max Hayward نہ شاعر تھا نہ افسانہ نگار۔ لیکن اس نے روسی نظم و افسانہ کے بہترین تراجم ہمارے زمانے میں پیش کیے۔ اردو میں بہت سے عمدہ شاعر، مترجم اور افسانہ نگار مترجم ہوئے ہیں۔ اور مولوی عنایت اللہ جیسا شخص بھی ہے کہ ان سے بہتر اور کثیر الترجمہ شخص کوئی ہمارے یہاں نہ ہوا۔ لیکن مولوی صاحب نہ شاعر تھے نہ ڈراما نگار۔

لہٰذا اس سلسلے میں کوئی حتمی قاعدہ نہیں ہو سکتا۔ بنیادی بات یہ ہے کہ مترجم دونوں زبانوں (یعنی اصل زبان اور ترجمے والی زبان) کے آہنگ کو جتنی خوبی سے سن سکے گا، اتنا ہی عمدہ ترجمہ وہ کر سکے گا۔ خلاق مترجم کی صفت یہ ہے کہ جس زبان سے وہ ترجمہ کر رہا ہے۔ اس کے ادب اور ادبی روایت سے وہ پوری طرح واقف ہوتا ہے۔ جس فن پارے کا ترجمہ کیا جا رہا ہے، صرف اس فن پارے سے گہری واقفیت کافی نہیں۔ اتنی ہی اہم بات یہ ہے کہ مترجم کو ترجمے والی زبان میں محسوس کرنے اور سوچنے پر قدرت ہونی چاہیے۔ ہم ہندستانی جب اردو/فارسی سے انگریزی میں ترجمہ کرتے ہیں۔ تو ہمیں مشکل یہ پڑتی ہے کہ ہم جدید روزمرہ معیاری انگریزی اور قدیم یا کتابی انگریزی میں فرق نہیں کر سکتے۔ یوسف حسین کا

ترجمۂ غالب اور خوشونت سنگھ کا ترجمۂ اقبال اس کمزوری کی نمایاں مثالیں ہیں۔ لیکن ایسی مثالیں بہت سی اور بھی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ شاید ہی کسی ہندوستانی پاکستانی ترجمے کی نشان دہی ہو سکے جو اردو سے جدید، معیاری اور بامحاورہ انگریزی میں کیا گیا ہو۔ اے کے رامانجن A.K. Ramanujan نے قدیم تامل سے جو تراجم انگریزی میں کیے ہیں ان کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ جدید انگریزی کس طرح ایک قطعی مختلف زبان اور قطعی اجنبی ادبی روایت کے فن پاروں کو آج کے پڑھنے والوں تک پہنچانے میں کامیاب ہو سکتی ہے۔ مغربی ترجموں میں فریئس پرچیٹ نے انتظار حسین، غالب اور داستان امیر حمزہ کو انگریزی میں منتقل کرنے میں خاصی کامیابی حاصل کی ہے۔

کیا مترجم کے لیے ضروری ہے کہ وہ اصل زبان اور ترجمے والی زبان ان دونوں پر پوری طرح اور یکساں قدرت رکھتا ہو؟ مستثنیات کو دیکھیے تو رابرٹ لاول Robert Lowell اور آڈن Auden ہیں جو روسی نہیں جانتے تھے، لیکن انھوں نے روسی کے ماہرین یا اس کو مادری زبان کی حیثیت سے بولنے والوں کی مدد سے روسی سے انگریزی میں بعض عمدہ ترجمے کیے ہیں۔ لیکن ترجمے کی کوئی طویل کارگذاری اس طرح نہیں چل سکتی۔ مثالی صورت تو یہ ہے کہ ہم صرف مادری زبان ہی میں خود کو پوری طرح غرق کر سکتے ہیں۔ اور اس طرح غرق ہوئے بغیر زبان میں خلاقانہ فکر کو حاصل کرنا ممکن نہیں۔ چونکہ بہت ہی کم لوگ ایسے ہیں جو صحیح معنوں میں ذولسانی Bilingual ہوں، اس لیے بہترین عملی صورتِ حال یہ ہوگی کہ مترجمین دو دو کی ٹیم کی شکل میں کام کریں۔ ایک مترجم کی مادری زبان اصل زبان ہو۔ اور وہ ترجمے والی زبان سے بھی خوب واقف ہو اور دوسرے مترجم کی مادری زبان ترجمے والی زبان ہو، لیکن وہ اصل زبان سے بھی بخوبی واقف ہو۔ اس طرح دونوں ایک دوسرے کی تکمیل اور پشت پناہی کریں گے۔ یہ اصول خاص کر مشرقی سے مغربی زبانوں میں ترجمے کے لیے کارآمد ہے۔ کیوں کہ ان دونوں کے درمیان تہذیبی تفاوت بہت بڑا ہے۔

ترجمے کو جاری رہنا چاہیے تاکہ ترجمے والی زبان، اور اس زبان کے ادب اور اس کے بولنے والوں کو تونگری حاصل ہو۔

خلیق انجم

شاعری کا ترجمہ

ترجمہ ناممکن ہے۔ لیکن اس کے بغیر کام بھی نہیں چل سکتا۔ اگر یہ فن نہ ہوتا تو یقیناً آج ہمارا علم بہت محدود ہوتا۔ انسانی یادداشت کو محفوظ رکھنے میں ترجموں کو بہت دخل ہے، اگر روم بغداد اور اسپین میں بہت بڑے پیمانے پر ترجمے نہ کیے جاتے تو آج فکرِ انسانی کی بہت سی کڑیاں گم ہوتیں۔ اردو میں یوطیقا کا جو ترجمہ ہے وہ انگریزی سے کیا گیا ہے۔ انگریزی میں اطالوی سے اور اطالوی میں عربی سے کیا گیا۔ عربی میں سریانی سے اور سریانی میں اصل زبان یعنی یونانی سے کیا گیا ہے۔ ارسطو کی اس تصنیف کا سلسلہ اس وقت شروع ہوا تھا جب کرۂ ارض بہت وسیع تھا آمدورفت کے ذرائع محدود تھے۔ وائرلیس اور ریڈیو جیسی ایجادوں کا تصور بھی نہیں تھا۔ مشینی ایجادوں نے فاصلے کم سے کم کر دیے ہیں۔ اب دنیا سمٹ کر ایک ایسا بڑا شہر بن گئی ہے۔ جس میں مختلف زبانیں بولنے والے لوگ رہتے ہیں۔ سائنس دان نے انسانوں کو ایک دوسرے سے قریب کیا ہے۔ اور مترجم نے انسانی ذہن کو ——— اب صرف اعلیٰ تصنیفات کا ہی نہیں بلکہ معمولی سی معمولی کتابوں، مضمونوں اور خبروں کا ترجمہ بھی ضروری ہے۔

ہر فن کے ترجمے کے مسائل الگ الگ ہیں۔ نظم کے مقابلے میں نثر کا ترجمہ نسبتاً آسان ہے نثر میں افسانے اور ناول کا ترجمہ ٹیکنیکل کتابوں کے مقابلے میں آسان ہے۔ بولی جانے والی زبان کا ترجمہ اور بھی زیادہ آسان ہے۔ اب ایسے کمپیوٹر ایجاد ہو گئے ہیں، جو کئی کئی زبانوں میں ایک ساتھ ترجمہ کرتے ہیں۔ اس کمپیوٹر کی ترقی کے امکانات بہت روشن ہیں۔ لیکن اس کا کام صرف روزمرہ استعمال ہونے والی زبان تک ہی محدود رہے گا۔ سب سے زیادہ مشکل اور بعض اوقات تو ناممکن کی حد تک مشکل کام نظم کا ترجمہ ہے۔ جس کے لیے ڈاکٹر جانسن نے بہت سیدھے سادے

اور مختصر الفاظ میں کہا تھا: "نظم کا ترجمہ تو جناب ہو ہی نہیں سکتا" اور وکٹر ہیوگو نے فیصلہ سنایا تھا "نظم کے ترجمے کا خیال ہی بے معنی اور ناممکن ہے۔" لیکن اس کے باوجود مغرب کے بعض صفِ اول کے ادیبوں اور شاعروں نے اس بے معنی اور ناممکن فن کی طرف توجہ کی ہے مثلاً ہوریس، سیسرو، لوتھر، ڈرائی ڈن، پوپ، شیلی اور کالرج وغیرہ نے بہت اہم ترجمے کیے ہیں۔

اردو کے صفِ اول کے ادیبوں اور شاعروں نے ترجمے میں کوئی کارنمایاں نہیں کیا۔ اور اگر تھوڑا بہت کام کیا بھی تو روپے کمانے کے لیے اور ایسے ترجموں سے ہمیں یہاں بحث نہیں جو سیاسی یا کاروباری مقصد کے لیے کیے جاتے ہیں۔ ہوتا یوں ہے کہ مترجم کو کوئی نظم پسند آتی ہے اور وہ اس حد تک متاثر ہوتا ہے کہ اس کا جی چاہتا ہے کہ اس کے پڑھنے والے بھی اس نظم سے لطف اندوز ہوں۔ عام طور سے نظم کے ترجمے کا محرک یہی جذبہ ہوتا ہے۔ اور اس محرک جذبہ کا تجزیہ یوں کیا جاتا ہے کہ مترجم کی حیثیت ایک ایسے شخص کی ہوتی ہے جو کسی ایک مصنف کی تلاش کرتا ہے جب اسے وہ مصنف مل جاتا ہے تو اس کے سہارے وہ خود میں چھپے ہوئے مصنف کو پالیتا ہے دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ کسی نظم کو پڑھتے ہوئے مترجم کو اچانک یہ احساس ہوتا ہے کہ جو خیالات، جذبات اور احساسات اس کے شعور اور لاشعور میں عرصے سے تھے، اور جن کے اظہار کے لیے اس کے پاس الفاظ نہیں تھے۔ وہ بہت موثر الفاظ میں بیان کر دیے گئے ہیں۔ اگرچہ یہ سب دوسری زبان میں ہوتے ہیں لیکن مصنف کے لیے انھیں اپنی زبان میں منتقل کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہوتا۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ شاعر اپنی زبان میں کوئی نظم یا غزل کا شعر پڑھ کر سوچتا ہے کہ یہ تو وہی بات ہے جو اس کے ذہن میں تھی لیکن واضح نہیں تھی اگر نظم یا غزل کا شعر ہر لحاظ سے مکمل ہے تو شاعر اسے پسند کرتا ہے۔ ورنہ اسے اپنے الفاظ کا جامہ پہناتا ہے اردو غزل میں ایسی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔

نظم کے ترجمے پر بحث کرنے سے پہلے بہتر ہے کہ فن شاعری پر تھوڑی سی بات کر لیں۔ افلاطون اصل عالم ایک عالم مثال کو مانتا ہے اس کا خیال ہے کہ اس عالم سفلی میں جو اشیاء نظر آتی ہیں وہ اصل نہیں بلکہ ناقص نقلیں ہیں۔ ان اشیاء کی جن کی اصل عالم مثال میں موجود ہے۔ افلاطون نے شاعروں کو اپنی ریاست سے اس لیے نکالا تھا کہ یہ عالم سفلی کی نقل کرتے ہیں گویا شاعری نقل در نقل ہونے کی وجہ

سے اور بھی ناقص ہوتی ہے۔ اگر ہم افلاطون کے اس انتہا پسندانہ فیصلے کو تسلیم نہ کریں تب بھی یہ تو ماننا پڑے گا کہ ترجمہ دراصل ترجمے کا ترجمہ ہے۔ جب بھی کوئی بات کہی جاتی ہے وہ کسی تجربے کی ترجمانی ہوتی ہے۔ اب اگر شاعر نے ایک نظم کہی ہے تو یہ کسی ایسے احساس یا تجربے کی ترجمانی ہے جو اس سے پہلے اس انداز سے کسی اور نے نہیں کی۔ مترجم جب اس نظم کا ترجمہ کرے گا تو وہ ترجمے کا ترجمہ ہوگا۔ پہلے مترجم یعنی شاعر نے خود حقیقت اور اصلیت پر مکمل طور پر گرفت نہیں کی تھی۔ اور دوسرا مترجم تو پہلے مترجم کے مقابلے میں اصلیت سے کچھ زیادہ ہی دور ہوگا۔

جب کوئی شاعر اپنا تجربہ بیان کرتا ہے تو اس تجربہ میں حقیقت کے ساتھ شاعر کے اپنے احساس اور جذبے کی بھی آمیزش ہوتی ہے۔ پھر دنیا کی کوئی زبان ایسی نہیں ہے۔ جو انسان کے احساسات اور تجربات کو مکمل طور پر الفاظ کے سانچوں میں ڈھالنے میں کامیاب ہو جائے۔ بعض شاعروں کے کلام کی شرحیں لکھی جاتی ہیں۔ اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک شعر کی شرح میں مختلف شارحین کو آپس میں نہ صرف اختلاف ہوتا ہے بلکہ بعض اوقات ان کی شرحیں متضاد ہوتی ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ شاعر کو اپنے خیال و فکر کے لیے مناسب الفاظ نہیں ملے (میں یہاں اس ابہام کا ذکر نہیں کر رہا ہوں جو جان بوجھ کے پیدا کیا جاتا ہے) ہمارے یہاں اس کی مثال غالب اور تھوڑے بہت مومن ہیں۔ غالب کے یہاں ایسے اشعار کی تعداد زیادہ ہے جن میں فکر اور الفاظ ایک دوسرے سے ہم آہنگ نہیں ہو سکے۔ اس لیے جتنی کلام غالب کی شرحیں چھپی ہیں اتنی کسی اور شاعر کی نہیں چھپیں۔ بلکہ خود غالب کو بارہا اپنے اشعار کی تشریح کرنی پڑی ہے۔ اگر دیوان غالب کے سب سے پہلے شعر کی شرح خود غالب نہ بیان کرتے تو آج اردو میں نہ جانے اس کا کیا مفہوم ہوتا۔ اگر شارحین کی شرح ہی میں تضاد ہو تو بے چارہ مترجم کیا کرے۔ ظاہر ہے کہ وہ کوئی تحقیقی کام نہیں کر رہا ہے۔ جو تمام شرحوں کا ترجمہ کر کے اپنے پڑھنے والوں کو بدمزہ کرے مجبوراً وہ ان شرحوں میں سے کوئی ایک انتخاب کرے گا۔ اور اس کا پورا پورا امکان ہے کہ وہ ایک ایسی شرح سے مدد لے جو ہرگز شاعر کا مطلب نہ ہو۔ میں اپنی بات کی وضاحت کے لیے غالب کا ایک سادہ سا شعر پیش کرتا ہوں۔

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

حالی نے اس شعر کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "دنیا میں جو کچھ چہل پہل ہے وہ صرف اس یقین کی بدولت ہے کہ یہاں رہنے کا زمانہ بہت تھوڑا ہے۔ ۔ ۔ ۔ اگر موت نہ آیا کرتی اور ابد تک زندہ رہنا ہوتا تو جینے میں کوئی مزا نہ آتا۔" اس کے برعکس طباطبائی نے اس شعر کی شرح یوں کی ہے "رقیب بوالہوس کو ہوس کی نشاط کا رو لطف وصلِ نگار حاصل ہے۔ اب ہمارے جینے کا مزا کیا رہا۔"

اگر حالی کی علمیت اور قابلیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، تو طباطبائی کے فہم و ادراک پر بھی شبہ کرنا مشکل ہے۔ لیکن ان دونوں نے مترجم کے لیے ایک مسئلہ بنا دیا ہے۔ وہ دونوں شرحوں میں سے کسے انتخاب کرے۔ بعض شعر تو ایسے ہوتے ہیں جن کے متعلق قطعی اور آخری فیصلہ کوئی شارح نہیں کر سکتا کہ شاعر کا اصل مطلب کیا ہے۔

یہ تو ایسا مسئلہ تھا جس سے مترجم بہت کم دوچار ہوتا ہے۔ کیوں کہ ہر زبان میں غالب جیسے شاعروں کی تعداد بہت کم ہے۔ اب وہ مسائل ملاحظہ ہوں جن سے کسی بھی شاعر کے کلام کا ترجمہ کرتے ہوئے مترجم کو واسطہ پڑتا ہے۔ کسی فرانسیسی ادیب نے کہا تھا:

اس قول کی صداقت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اول تو اس فقرے کا اردو ترجمہ انتہائی مشکل ہے۔ اور اگر کسی طرح کر بھی دیا جائے تو کے لفظ کی وجہ سے جو انگریزی فقرے میں حسن ہے اسے اردو ترجمے میں پیدا کرنا ممکن نہیں۔ ہر شاعری کا ایک تاریخی، تہذیبی فکری اور لسانی پس منظر ہوتا ہے۔ یہ پس منظر شاعری کو مخصوص فلسفہ، نقطۂ نظر، تلازمے، تلمیحیں، تشبیہیں اور استعارے دیتا ہے۔ فلسفہ اور نقطۂ نظر کا ترجمہ ممکن ہے لیکن باقی چیزوں کا ترجمہ اکثر و بیشتر ناممکن ہوتا ہے۔ میں یہاں نظم کی بجائے غزل کے بعض اشعار کے حوالے دوں گا۔ کیوں کہ جو مسائل نظم کے ترجمے میں کبھی کبھی پیدا ہوتے ہیں غزل میں مترجم کو اکثر ان کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ میر کا ایک شعر ہے۔

جم گیا خون کفِ قاتل پہ ترا میر زبس
ان نے رو رو دیا کل ہاتھ کو دھوتے دھوتے

محبوب اور عاشق کا یہ تصور سو فی صدی مشرقی ہے۔ اور یہ غالباً صرف فارسی اور فارسی سے متاثر ہونے والی زبانوں میں ملتا ہے۔ اس پورے تصور کا انگریزی ترجمہ اس طرح کرنا بہت مشکل ہے کہ انگریزی داں اس سے لطف اٹھا سکیں۔ پھر بات بہت معمولی ہے اس کا انگریزی ترجمہ کچھ اس طرح ہوگا۔ "جب محبوب نے عاشق کو قتل کیا تو عاشق کا خون اس کے ہاتھوں پر لگ گیا اور محبوب نے جب ہاتھ دھوئے تو خون دیکھ کر رونے لگا۔" یقیناً یہ ترجمہ مضحکہ خیز ہوگا۔ حالاں کہ اردو میں یہ شعر مضحکہ خیز نہیں ہے۔ یہ مفہوم معمولی سہی لیکن اس میں وہ سوز و گداز ہے جو میر کے اندازِ بیان کا حصہ ہے اور شعر کی ساری خوبی الفاظ کی تکرار ہے "رو رو دیا" اور "دھوتے دھوتے" سے نہ صرف صوتی حسن پیدا ہوا ہے۔ بلکہ اسی تکرار نے مفہوم میں معنویت اور وسعت پیدا کی ہے۔ یہی تکرار انسانیت کی اعلیٰ قدروں کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے۔ انگریزی ترجمہ ان خوبیوں سے محروم رہے گا۔ فیض احمد فیض کا ایک شعر لیجیے:

ہمیں سے سنتِ منصور و قیس زندہ ہے
ہمیں سے باقی ہے گل دامنی و کج کلہی

اس شعر میں منصور و قیس، سنت، گل دامنی اور کج کلہی نے حسن پیدا کیا ہے۔ اور ان تمام الفاظ کا ترجمہ اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے اور ترجمے میں وہ اثر پیدا کرنا جو اس شعر میں ہے ناممکن ہے۔

اردو اور فارسی میں پیرِ مغاں، ساقی، مغ بچے، زاہد، رند، محتسب اور ناصح لغوی معنوں ہی میں استعمال نہیں ہوتے بلکہ ان کے ساتھ کچھ سماجی تصورات بھی وابستہ ہیں۔ مثلاً ریاض خیرآبادی کا ایک شعر ہے۔

دیکھنا پیرِ مغاں، حضرت زاہد تو نہیں
کوئی بیٹھا نظر آتا ہے پسِ خم مجھ کو

مترجم اگر اس شعر کا لفظی ترجمہ کرے تو شعر بے معنی ہوگا اور اگر اس کی تفصیل بیان کرے تو ترجمہ قطعی بے مزہ ہوگا۔ بعض شعروں میں جو ایمائیت اور اختصار ہوتا ہے اس کا لطف صرف اہلِ زبان ہی اٹھا سکتے ہیں۔ غالب کا مشہور شعر ہے۔

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی، وہ میرا آشیاں کیوں ہو

اگر اس شعر کا صرف دو مصرعوں میں ترجمہ کیا جائے تو ترجمہ مہمل ہوگا۔ کیوں کہ یہاں قفس، چمن ہم دم، بجلی اور آشیاں وغیرہ اصل سے کچھ زیادہ معنی رکھتے ہیں۔

دنیا کی کسی بھی زبان میں کوئی دو لفظ ایسے نہیں ہو سکتے جو معنی کے اعتبار سے مکمل طور پر ایک دوسرے کے مترادف ہوں۔ پھر ایک لفظ کا دوسری زبان میں قطعی مترادف ڈھونڈھنا بے سود ہے مترجم قریب المعانی الفاظ استعمال کرتا ہے۔ جو ظاہر ہے کہ ترجمے کو اصل سے کچھ نہ کچھ ضرور دور کر دیتا ہے۔

اس سے بڑھ کر فارم کا مسئلہ ہے نظم کا ترجمہ نظم میں کیا جائے یا نثر میں۔ نظم کا ترجمہ نظم میں کرنے میں پہلا مسئلہ بحر کا ہے۔ اگر دونوں زبانیں ایسی ہیں جو ایک خاندان سے تعلق رکھتی ہیں اور پھر دونوں میں بحریں اور اوزان مشترک ہیں تو یہ مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔ اس کی بہترین مثال کلاسیکل فارسی اور اردو میں ہے۔ ان دونوں زبانوں میں نہ صرف بحریں مشترک ہیں بلکہ الفاظ، تلازمے، سماجی تصورات تلمیحیں، تشبیہیں اور استعارے بھی مشترک ہیں اس لیے مترجم کو زیادہ دشواری نہیں ہوتی بلکہ بعض اوقات تو ایک آدھ لفظ اور فعل کا ترجمہ کر دینے سے کام بن جاتا ہے۔ مثلاً ایک فارسی شعر ہے۔

آلودۂ قطرات عرق دیدہ جبیں را
اختر ز فلک می نگرد روئے زمیں را

سودا نے اردو ترجمہ اس طرح کیا ہے۔

آلودہ قطرات عرق دیکھ جبیں کو
اختر پڑے جھانکیں ہیں فلک پر سے زمیں کو

غالب کا ایک شعر ہے۔

نقش ناز بت طناز بہ آغوش رقیب
پائے طاؤس پے خامۂ مانی مانگے

اس شعر میں صرف "مانگے" کو "خواہد" سے بدل دیں تو کام یاب اور مکمل ترین ترجمہ ہو جاتا

ہے۔ لیکن مشکل اس وقت ہوتی ہے جب دونوں زبانوں میں کوئی چیز مشترک نہ ہو۔ اگر اردو نظم کا انگریزی میں ترجمہ کیا جائے تو مترجم کو انگریزی بحر کا انتخاب کرنا ہوگا اور جو ظاہر ہے کہ اردو بحر سے بہت مختلف ہوگی اور یہی وہ مشکل ہے جس میں اکثر مترجم ناکام ہوتے ہیں۔ اسی لیے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ترجمہ نثر میں ہی کرنا چاہیے۔ جو لوگ اس حق میں ہیں کہ ترجمہ نظم ہی میں کیا جائے انھیں نثری ترجمے پر یہ اعتراض ہے کہ ممکن ہے اپنی پوری کوشش صرف کر کے مترجم مصنف کی اصل روح کو پالے اور وہی کچھ لکھے جو مصنف نے کہا ہے۔ لیکن نثر میں الفاظ کی وہ موسیقیت اور صوتی اثرات منتقل نہیں ہو پاتے۔ جو اصل نظم میں ہیں۔ نثری ترجمہ تو ایک رنگین تصویر کا پنسل اسکیچ بن جاتا ہے۔ سیموئل ٹیلر کے اوڈیسی کے انگریزی ترجمے کا پیش لفظ لکھتے ہوئے ایم۔ ایم۔ ول کوک نے لکھا تھا۔ یہ غور طلب امر ہے کہ نظم کا نظم میں ترجمہ اطمینان بخش ہوتا ہے یا نہیں۔ اس کے بہت سے وجوہ ہیں۔ اول تو یہ کہ ہمیں اب یہ عادت نہیں کہ طویل تصنیفات کو نظم میں پڑھیں۔ دوسرے اگر ترجمہ ایک مخصوص وزن اور بحر میں کیا جائے تو اس سے مترجم کو اصل متن کے صاف اور واضح ترجمہ کرنے کے علاوہ کچھ مزید دقتوں کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تیسرے نثر نگار پوری کام یابی کے ساتھ مصنف اور پڑھنے والوں کے درمیان اپنی شخصیت کو دخل انداز ہونے سے باز رکھ سکتا ہے۔ نظم کے ترجمہ میں تو خیر الگ بات ہے، نثری ترجمہ میں بھی جتنا شاعرانہ حسن ہوگا۔ اتنا ہی ایک دوسرے طرح اور دوسرے نقطۂ نظر کا اصل تصنیف میں دخل ہوگا۔

نظم میں ترجمہ کرنے کے لیے مترجم کا شاعر ہونا ضروری ہے۔ ایسی صورت میں مترجم کی اپنی شاعرانہ شخصیت ہوگی۔ جسے وہ اپنی پوری کوشش کے باوجود ترجمے سے الگ نہیں رکھ سکتا اگر مترجم اچھا شاعر ہے تو اس کا امکان ہے کہ ترجمہ اصل سے بہت بہتر ہو جائے۔ دوسری صورت میں ترجمہ اصل سے برا ہوگا۔ مترجم عظیم مصنف تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور جب ناکام ہو جاتا ہے تو اسے اپنی سطح پر لے آتا ہے۔

فٹز جے رلڈ کی شہرت کا دارو مدار عمر خیام کے ترجمے پر ہے۔ اس کی رباعیوں کے بارے میں ایف۔ مین نے لکھا ہے:

فٹز جے رلڈ نے عمر خیام کا اتنا ترجمہ نہیں کیا جتنا کہ رباعیات کے شاعرانہ حسن اور

خوب صورتی کو اپنے خیالات میں سمویا ہے اور یہ کام اس قدر مہارت اور حسن کے ساتھ کیا گیا ہے کہ بعض لوگوں کا خیال ہے انگریزی ترجمہ اصل سے بہت بہتر ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اس نے متن کے ترجمے میں بہت آزادی سے کام لیا ہے۔ مترجم کی بدنصیبی ہے کہ اس کے ترجمے کے بارے میں یہ رائے دی جائے۔ یہ ترجمہ کی تعریف نہیں بلکہ ہجو ملیح ہے۔ بینٹلے نے بھی پوپ کے کیے ہوئے ایلیڈ کے ترجمے کے بارے میں اسی انداز سے ہجو ملیح کی تھی۔ اس نے لکھا تھا: "بہت حسین نظم ہے لیکن اسے ہومر کی تصنیف نہیں کہنا چاہیے"۔

اردو میں ترجموں کی تعداد دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ اور ان میں اکثر ترجموں کے بارے میں قطعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ مترجمین کی شرافت ہے جو انھیں ترجمہ بتاتے ہیں۔ ورنہ وہ ان کی تصنیفات ہیں۔ شکنتلا کے ایک مترجم سے کسی نقاد نے بہت صحیح کہا تھا کہ آپ اپنے ڈرامے کے کرداروں کے نام بدل دیجیے۔ اس سے کبھی کبھی کالی داس کی شکنتلا کا دھوکہ ہوتا ہے۔

اردو میں شکنتلا کے بہت ترجمے ہوئے ہیں۔ میں یہاں اختر حسین رائے پوری، منور لکھنوی اور ساغر نظامی کے ترجموں کے ایک چھوٹے سے حصے کا موازنہ کرنا چاہتا ہوں۔ پہلا ترجمہ نثر میں دوسرا نظم و نثر دونوں میں اور تیسرا صرف نظم میں ہے۔ اسی اعتبار سے یہ اپنی اصل سے دور ہیں۔ اختر حسین رائے پوری کا ترجمہ پیش کرنے سے پہلے ایک بات اور عرض کر دوں۔ میں نے اپنے دوست ڈاکٹر تارک ناتھ بالی سے شکنتلا کا یہ حصہ سنسکرت سے اردو میں لفظاً ترجمہ کرایا تھا اس ترجمے سے یہ اندازہ ہوا کہ اختر حسین اصل سے قریب ترین ہیں۔ اور شاید اس سے بہتر ترجمہ ممکن نہ ہو۔

راجا دشینت چھپا ہوا شکنتلا کے حسن کا پہلی بار نظارہ کر رہا ہے، وہ کہتا ہے:

واقعی یہ چھال اس دھان پان کے لیے ناموزوں ہے کاندھے پر بندھے ہوئے اور جو بنوں کو جکڑے ہوئے چھال کے برن میں اس کا کھلتا ہوا بدن ویسا ہی ہے بے بس جیسے سوکھی پتیوں میں ڈھکا ہوا پھول۔

مگر حسن خداداد کو بناؤ سنگار کی پروا ہی کیا۔ چاند کے جمال کو اس کا سیاہ داغ دونق بخشتا ہے۔ کنول کیچ میں لپٹ کر بھی ہزار حسینوں کا ایک حسین رہتا ہے۔ یہ سرو قد چھال کے کپڑوں میں بھی بھلی لگتی ہے۔ کیوں کہ حسن کے لیے کون سی شے باعث زیب نہیں ہے۔

اب منور لکھنوی کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

سنسکرت متن میں یہ تمام باتیں راجا خود سے کرتا ہے منور صاحب کے ہاں یہ الفاظ شکنتلا کی سہیلی پریم ودا کی زبانی کہلائے گئے ہیں۔

کب تنِ نازک کے لائق چھال کی پوشش ہے یہ — زیوروں کی طرح پھر بھی جانِ آرائش ہے یہ
گھاس پانی کی کنول کے گرد ہوتی ہے ہزار — پھر بھی اس کا حسن رہتا ہے ہمیشہ برقرار
چاند کے پہلو کا دھبہ دھبہ رسوائی ہو کیوں — اور بھی ہوتی ہے اس سے اس کی زیبائش فزوں
دیدہ بینا ہے شاہد دیدنی ہے اس کی شان — چھال کی پوشاک نے بھی حسن میں ڈالی ہے جان
خوبصورت جسم پر ہر شے کا بڑھتا ہے وقار — خوبصورت جسم سے ہر شے کو ملتا ہے نکھار

کالی داس نے "گھاس پانی کی" جگہ "کیچڑ" کہا ہے کاندھے پر بندھے ہوئے اور جو بنوں کو جکڑے ہوئے چھال کے برن میں اس کا کھلتا ہوا بدن ویسا ہی بے بس ہے۔ جیسے سوکھی پتیوں میں ڈھکا ہوا پھول" منور صاحب نے اس مفہوم کو قطعی ترک کر دیا ہے۔ منور صاحب کے آخری دو شعر جس مفہوم کا ترجمہ ہے وہ یہ ہے "یہ سرو قد چھال کے کپڑوں میں بھی بھلی لگتی ہے۔ کیوں کہ حسن کے لیے کون سی شے باعث زیب نہیں ہے۔ مختصر یہ کہ منور صاحب کے ترجمے میں خط کشیدہ الفاظ زائد ہیں۔ کچھ عبارت انھوں نے چھوڑ دی اور کچھ عبارت کا مفہوم بالکل بدل دیا۔ دس میں صرف تین مصرعے ایسے ہیں جو اصل سے کچھ کچھ قریب ہیں۔

ساغر نظامی کے ترجمے میں شاعرانہ حسن بدرجۂ اتم ہے اور اسی لیے یہ اصل سے اور بھی زیادہ دور ہے۔

راجا (خود سے) سچ سچ کہاں یہ چھال اور کہاں یہ دھان پان کامنی دوش پر یہ بندھے اور جکڑے ہوئے رس بھرے جوبنوں کو کے

جنگلی چھان کا یہ برن
اس میں کھلتا ہوا چمپئی اس کا کومل بدن
ہے اسی طرح مجبور حالات سے
جس طرح خشک پتوں کے آغوش میں
پتیوں سے ڈھکا کوئی تازہ سمن
حسن فطرت کو لیکن ضرورت ہے کیا — اس کو بننے سنورنے کی حاجت ہے کیا
چاند کا داغ ہی چاند کے روپ کو — حسن اور دل کشی کی کرن بخشتا ہے
کیچ میں رہ کے بھی نرم و نازک کنول — حسن اور نور و پاکیزگی بخشتا ہے
حسن میں اس کے آتی نہیں کچھ کمی

آہ ان چھال کے کپڑوں میں یہ نازک اندام
اور بھی چاند کا ٹکڑا نظر آتی ہے مجھے
کون سی چیز ہے اس عالم امکان میں بھلا

پیکر حسن پہ جو باعث صد زیب نہیں۔ اس آہو چشم کے پیکر پر۔ چھال کا سخت سخت یہ کپڑا جو بندھا ہے گلے سے نیچے تک۔ سخت ہوتے ہوئے بھی دل میں ذرا۔ نہیں کرتا کراہتیں پیدا جیسے پھولوں لدی کنول کی شاخ۔ پھول سے لے کر شاخ کی جڑ تک۔ سخت اور کھردری کنول کی شاخ دیکھنے میں بری نہیں لگتی۔

اس ترجمے میں تمام خط کشیدہ الفاظ کا شکنتلا کے مصنف سے کوئی تعلق نہیں یہ ساغر صاحب کی اپنی تخلیق ہیں۔

سب سے بڑا ستم یہ ہے۔ ساغر صاحب نے اپنے استعارے اور تشبیہیں استعمال کی ہیں جو ترجمے کو اصل سے بہت دور لے گئیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ساغر صاحب کی اپنی شاعرانہ شخصیت ترجمے میں در آئی ہے۔ انھوں نے نہ صرف اصل میں بہت زیادہ ترمیم کی ہے بلکہ بہت زیادہ اضافہ بھی کیا ہے۔ حالاں کہ ترجمے کے بنیادی اصول یہ ہیں۔

۱۔ اصل عبارت کسی حالت میں ترک نہیں کرنا چاہیے۔

۲۔ مترجم کو اپنی طرف سے کوئی اضافہ نہیں کرنا چاہیے۔ نہ صرف عبارت میں بلکہ تشبیہات اور استعارات میں بھی۔

۳۔ مترجم کو ترجمے کی سہولت کے لیے عبارت کو آگے پیچھے کرنے کا کوئی حق نہیں جیسا کہ منور صاحب نے کیا ہے۔

۴۔ اصل عبارت میں کسی طرح کی ترمیم بھی جائز نہیں

نظم کا ترجمہ نظم میں کیا جائے یا نثر میں اس پر متضاد خیالات ہیں۔

کارلائل، آرکی بشپ اور ویلے متفق ہیں کہ شاعری وزن اور بحر کے جمالیاتی حسن کے بغیر ناممکن ہے۔ جب کہ میتھو آرنلڈ کا خیال ہے کہ اگر ترجمہ نثر میں کیا جائے تو بھی اس میں اعلیٰ درجے کا شاعرانہ حسن پیدا کیا جا سکتا ہے۔

www.kitaabistan.com

مولوی سید وحید الدین سلیم

اصولِ اصطلاح سازی

تمہید

وضع اصطلاحات یا اصطلاح سازی کا مسئلہ خاص طور پر نہایت اہم اور نہایت دلچسپ ہے۔ میں مدت دراز سے اس مسئلہ پر غور کرتا رہا ہوں۔ انجمن ترقی اردو اور جامعہ عثمانیہ (حیدرآباد) نے اردو زبان میں علمی کتابوں کے ترجمہ کا کام اپنے ذمے لیا ہے۔ اس بنا پر آج کل اردو زبان میں وضع اصطلاحات کا مسئلہ بہت زیادہ مہتم بالشان ہو گیا ہے۔ ہر طرف یہ بحث چھڑ گئی ہے کہ اصطلاحیں وضع کرنے کا کونسا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ درحقیقت یہی وہ وقت ہے جبکہ ہمیں کسی صحیح اور موزوں طریقۂ اصطلاح سازی کی جستجو کرنی چاہیے۔ اگر آج اس راہ میں کوئی غلط قدم اٹھایا گیا، تو منزلِ مقصود تک پہنچنا دشوار ہو جائے گا۔ اگر آج اس عظیم الشان علمی عمارت کی بنیاد رکھتے وقت پہلی اینٹ کج رکھی گئی، تو پھر اس کی دیواریں چاہے ثریا تک بلند کی جائیں ہر دیوار کج ہوگی اور کچھ عرصہ کے بعد یہ عمارت مرکزِ ثقل سے ہٹ کر زمین پر آ رہے گی۔

یہی ضرورت ہے، جس نے مجھے اس بات پر آمادہ کیا ہے کہ میں اصطلاح سازی کے اہم مسئلہ پر اپنے خیالات اربابِ بصیرت کی خدمت میں پیش کروں چنانچہ میں نے ان اوراق

---

[1] مولوی سید وحید الدین سلیم عثمانیہ کالج حیدرآباد دکن میں پروفیسر تھے۔ انھوں نے انجمن ترقی اردو کے سکریٹری مولوی عبدالحق کی فرمائش پر "وضعِ اصطلاحات" نام سے ایک کتاب لکھی جسے ۱۹۲۱ء میں انجمن ترقی اردو نے شائع کیا۔ اردو میں اصطلاح سازی کے موضوع پر یہ پہلی کتاب ہے اسی کتاب سے یہ باب نقل کیا گیا ہے۔

میں وضاحت اور تفصیل کے ساتھ اپنے خیالات درج کر دیے ہیں۔

اصطلاح کی ضرورت کیا ہے؟

اصطلاح کی ضرورت ایسی نہیں ہے جس سے لوگ آگاہ نہ ہوں۔ اگر اصطلاحیں نہ ہوں، تو ہم علمی مطالب کے ادا کرنے میں طولِ لاطائل سے کسی طرح نہیں بچ سکتے جہاں ایک چھوٹے سے لفظ سے کام نکل سکتا ہے، وہاں بڑے بڑے لمبے جملے لکھنے پڑتے ہیں اور ان کو بار بار دہرانا پڑتا ہے۔ لکھنے والے کا وقت جدا ضائع ہوتا ہے۔ اور پڑھنے والے کی طبیعت جدا ملول ہوتی ہے۔ اصطلاحیں درحقیقت اشارے ہیں، جو خیالات کے مجموعوں کی طرف ذہن کو فوراً منتقل کر دیتے ہیں۔

بعض حضرات کی رائے ہے کہ اصطلاحیں وضع کرنے سے حافظہ پر بار پڑتا ہے۔ سہولت اسی میں ہے کہ ہر اصطلاح سے جو معنی مطلوب ہیں، وہ تشریح و تفصیل کے ساتھ بیان کر دیے جائیں مگر ایسا کرنے میں یہی دقت ہے کہ لکھنے والے اور پڑھنے والے دونوں کا وقت ضائع ہوتا ہے اور کاغذ کا صرف جدا ہوتا ہے۔ حافظہ پر بار پڑنے کی شکایت جو ان حضرات نے کی ہے وہ بھی صحیح نہیں ہے، کیوں کہ جو شخص کسی علم یا فن کو سیکھنا چاہتا ہے۔ بس اسی علم یا فن کی اصطلاحیں اسے یاد کرنی پڑتی ہیں۔ اس سے یہ باز پرس نہیں کی جاتی کہ وہ تمام علوم و فنون کی اصطلاحیں کیوں نہیں جانتا۔ یورپ میں بھی جہاں تعلیم عام اور جبری ہے کوئی شخص ایسا نہیں ملے گا جو دنیا بھر کے علوم و فنون کی اصطلاحیں از بر رکھتا ہو۔ ہر صاحبِ فن صرف اپنے فن کی اصطلاحات اور اس فن کی معلومات سے آگاہ ہوتا ہے۔

اصطلاحات ہی پر کیا موقوف ہے، اگر آپ عام زبان پر غور کریں تو ہر لفظ ایک آوازی اشارہ ہے، جو خیالات کے ایک بڑے مجموعے کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ لفظوں کے بنانے کی ضرورت ہی اس بنا پر پیش آئی ہے کہ خیالات کے مجموعوں کو بول چال میں بار بار دہرانا نہ پڑے تاکہ بولنے والے اور سننے والے کا وقت ضائع نہ ہو اور ایک شخص کا ما فی الضمیر دوسرے شخص کے دل میں آسانی سے اتر جائے۔

ان آوازی اشاروں سے جن کے مجموعے کا نام زبان ہے بلاشبہ حافظہ پر کسی قدر بار پڑتا ہے، مگر یہ تھوڑی تکلیف اس بڑی تکلیف سے بچنے کے لیے گوارا کی گئی ہے۔ جو اعضائی اشاروں سے کام لینے میں برداشت کرنی پڑتی تھی۔ جب زبان ایجاد نہیں ہوئی تھی تو آوازوں کی جگہ اعضائی اشاروں سے کام لیا جاتا تھا۔ ہر شخص اپنے دل کا مطلب دوسرے شخص کو سمجھانے کے لیے ہاتھ پاؤں اور آنکھوں کے اشاروں سے کام لیتا تھا۔ یہ اشارے عجیب و غریب اور مختلف قسم کے ہوتے تھے۔ پالن ایشیا کے جزائر میں بعض وحشی قومیں اب بھی ایسی موجود ہیں، جو آوازوں کی جگہ ایسے اشاروں سے کام لیتی ہیں۔ بات چیت کرنے کے وقت ان سے عجیب عجیب حرکات ظہور میں آتی ہیں۔ جن جزائر کی وحشی قوموں میں کچھ آوازیں پیدا ہو گئی ہیں، ان میں اشاروں کی کمی صاف نظر آتی ہے۔ آوازوں یا لفظوں کی ترقی سے اعضائی اشارات بتدریج کم ہوتے گئے ہیں۔ جن قوموں کی زبان میں نسبتاً الفاظ زیادہ ہیں، وہ بمقابلہ ان قوموں کے جن کی زبان میں لفظوں کی کمی ہے، اعضائی اشارات کا استعمال بہت کم کرتی ہیں۔ چوں کہ آوازی اشاروں میں اعضائی اشاروں کی نسبت بہت کم تکلیف ہے، اس لیے الفاظ کی تعداد زبانوں میں رفتہ رفتہ بڑھتی گئی ہے اور ان کے یاد رکھنے کی کوشش برابر ہوتی رہی ہے۔ اس کا انجام یہ ہوا کہ الفاظ کے یاد رکھنے میں حافظہ پر جو بار پڑتا تھا، وہ بھی متواتر یاد کرنے کی مشق سے کم ہوتا گیا اور خود حافظے بھی قوی ہوتے گئے۔ چناں چہ مورخوں نے بیان کیا ہے کہ دنیا کی وہ قدیم قومیں جو سنسکرت، لاطینی، یونانی اور عربی زبان بولتی تھیں، ان کے حافظے بمقابلہ دیگر ہم عصر اقوام کے نہایت قوی تھے۔ یہ وہ زبانیں ہیں، جن میں الفاظ کی تعداد بمقابلہ دیگر قدیم زبانوں کے بہت زیادہ ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ الفاظ اس لیے ایجاد کیے گئے تھے کہ اعضائی اشاروں میں جو سخت تکلیف ہوتی تھی اس سے بچیں۔ الفاظ کے یاد رکھنے میں بیشک حافظہ پر بار پڑتا تھا، مگر یہ تکلیف بمقابلہ اس تکلیف کے کم تھی، اس لیے خوشی سے برداشت کی گئی۔ پھر لفظوں کے یاد رکھنے کی متواتر کوشش سے حافظہ کا بار بھی کم ہو گیا اور اس مشاقی سے خود حافظہ طاقتور ہو گیا۔ پس لفظوں کی افزائش سے حافظہ پر بار پڑنے کی شکایت کسی طرح معقول نہیں ہے۔ کیوں کہ

اول تو یہ تکلیف بمقابلہ اس تکلیف کے بہت ہی کم ہے، جو لفظوں کے نہ ہونے کی صورت میں ہم کو برداشت کرنی پڑتی۔ دوسرے موجودہ صورت میں خود حافظہ کی مشق اور اس کی تقویت متصور ہے۔

اس کے علاوہ ہم کو ایک اور اہم بات پر غور کرنا چاہیے۔ الفاظ معلومات پر دلالت کرتے ہیں۔ اور الفاظ کی بہتات معلوم کی بہتات پر دلالت کرتی ہے۔ پس جس قوم کی زبان میں الفاظ کی تعداد کثیر ہے اس کی معلومات کا دائرہ بھی بمقابلہ اس قوم کے جس کی زبان میں الفاظ کی قلت ہے، نہایت وسیع ہوگا۔ اس بنا پر پہلی قوم بمقابلہ دوسری قوم کے لازمی طور پر زیادہ تہذیب ہوگی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو حضرات الفاظ کی افزائش کے شاکی ہیں اور حافظہ پر بار پڑنے کا عذر پیش کرتے ہیں، وہ گویا اپنی قوم کو تہذیب و تمدن سے بھگاتے اور وحشت و بربریت کی طرف گھسیٹ کر لے جانا چاہتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا کہ وہ اپنے ابنائے جنس کو ترقی کی بلندی سے نیچے اتار کر تنزل کے غار میں دھکیلنا چاہتے ہیں۔ ان حضرات کو سوچنا اور سمجھنا چاہیے کہ زندگی اور تمدن کی ضروریات ہی الفاظ کو عدم سے وجود میں لاتی ہیں۔ گاؤں میں تمدن کی ضروریات کم ہیں۔ اس لیے گاؤں کے رہنے والے کم و بیش دو سو الفاظ سے اپنا کام چلا لیتے ہیں، مگر جب ان کو شہروں میں آنا پڑتا ہے اور شہریوں سے معاملہ کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ تو ضرورتاً ان کے الفاظ میں اضافہ ہوتا ہے اور اب تین چار سو الفاظ کے بغیر ان کا کام نہیں چل سکتا۔ گاؤں والوں کی نسبت شہر والوں کی ضروریات زندگی زیادہ ہیں، اس لیے ان کی زبان میں الفاظ کی تعداد کثیر ہے اور گاؤں والوں کی زبان سے کچھ نسبت نہیں۔ پھر بڑے شہروں، دارالسلطنتوں، تجارتی منڈیوں، صنعتی کارخانوں اور علمی مرکزوں میں زندگی بسر کرنے والوں کی ضروریات تمدنی اور بھی زیادہ ہیں۔ ان کو لازمی طور پر الفاظ کا بہت بڑا ذخیرہ اپنے ذہنوں میں محفوظ رکھنا پڑتا ہے۔ اگر یہ لوگ معترض حضرات کی طرح اپنے حافظہ پر بار ڈالنا نہ چاہیں، تو ان کو چاہیے کہ ان بڑے تمدنی مرکزوں سے بھاگیں اور عام شہروں میں زندگی بسر کریں۔ پھر اگر عام شہری باشندے حافظے پر بار ڈالنے سے بچنا چاہیں تو ان کو لازم ہے کہ وہ دیہات میں جا کر آباد ہوں۔ اسی طرح اگر دیہات کے باشندوں کے دماغ دو تین سو الفاظ

کے بوجھ کا بھی تحمل نہ کر سکیں، تو پھر ان کے لیے پالن ایشیا کے ان جزیروں میں سکونت اختیار کرنا موزوں ہوگا۔ جہاں آوازی اشاروں یعنی الفاظ کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اگر ہم ترقی کرنا چاہتے ہیں، اگر ہم شائستہ اور مہذب قوموں کی صف میں داخل ہونا چاہتے ہیں اور اگر ہم علوم وفنون حاصل کرنا زندگی کا اہم مقصد جانتے ہیں تو زبان میں جدید الفاظ اور اصطلاحات کے اضافے سے ہم کو ڈرنا نہیں چاہیے، کیوں کہ ترقی کے لیے اس بوجھ کا برداشت کرنا ناگزیر ہے۔

وضع اصطلاحات کے خلاف ایک نئی رائے

بعض بزرگوار ہیں، جو وضع اصطلاحات کی ضرورت تو تسلیم کرتے ہیں، مگر اصطلاح سازی کے خلاف ایک نئی رائے رکھتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ الفاظ جو پہلے بن چکے اور پھیل کر مقبول ہو چکے ہیں، ان کے بنانے والوں کے نام معلوم نہیں ہیں۔ ان کے نزدیک صرف ایسے ہی الفاظ زبان میں داخل ہونے اور تسلیم کیے جانے کی قابلیت رکھتے ہیں، جن کے وضع کرنے والوں کے نام معلوم نہ ہوں۔ اگر کوئی خاص آدمی کوئی نیا لفظ وضع کرے تو وہ لفظ زبان میں داخل نہیں ہو سکتا۔ یہ بزرگوار اگر ذرا بھی تامل فرماتے تو یہ بات ان کے ذہنوں پر ضرور منکشف ہو جاتی کہ ہر زبان میں جو الفاظ بنائے جاتے ہیں، ان کے بنانے کے وقت تمام قوم ایک جگہ مجتمع ہو کر ان الفاظ کو وضع نہیں کرتی۔ اول کوئی خاص آدمی کسی خاص لفظ کو وضع کرتا اور اس کو استعمال کرتا ہے۔ پھر اگر وہ لفظ اس معنی پر صاف اور روشن طور سے دلالت کرتا ہے، جس کے لیے وہ وضع کیا گیا ہے اور قواعد زبان کے خلاف بھی نہیں ہوتا تو اور لوگ بھی رفتہ رفتہ اس کو قبول کر کے استعمال کرنے لگتے ہیں، شخص واضع کی شخصیت سے عام لوگوں کو کوئی بحث نہیں ہوتی۔ اس لیے عموماً اس کی شخصیت فراموش کر دی جاتی ہے۔ اور کسی کو یاد نہیں رہتا کہ اس لفظ کو کس شخص نے اول وضع کیا تھا۔ عام لوگوں کی نظر صرف اس ضرورت پر رہتی ہے جس کے لیے لفظ بنایا جاتا ہے۔ اگر وہ ضرورت لفظ موضوع سے پوری نہ ہوتی ہو اور وہ لفظ آسانی سے زبان پر نہ چلتا ہو تو اس کے رد کرنے میں دیر نہیں ہوتی۔ وہ یہ بھی نہیں

دیکھتے کہ لفظ کا بنانے والا کون ہے اور اس تحقیقات کی ضرورت ان کو کبھی پیش نہیں آتی۔ یہی وجہ ہے کہ کسی زبان کے عام الفاظ کی تاریخ معلوم نہیں ہو سکتی مگر علمی الفاظ میں سے بہت سے الفاظ ایسے ہیں، جن کی تاریخ معلوم ہو سکتی ہے اور جن کی وضع کرنے والوں کے نام بھی معلوم ہو سکتے ہیں۔ اگر یہ بزرگوار ذرا سی تکلیف برداشت کریں اور ویبسٹر ڈکشنری کو ملاحظہ فرمائیں تو انگریزی زبان کے علمی الفاظ کی بہت سی ایسی مثالیں ان کو معلوم ہو جائیں گی۔ آج یورپ کے علما میں کوئی شخص ایسا نہیں ملے گا۔ جو ان علمی الفاظ کو جن کی تاریخ اور جن کے واضعوں کے نام معلوم ہیں، قبول نہ کرتا ہو اور محض اس بنا پر رد کر دیتا ہو کہ ان کی تاریخ مجہول نہیں ہے۔

اردو زبان کو مسخ کرنے کی تجویز

ان عجیب وغریب خیال رکھنے والے بزرگواروں سے جو اصطلاحات کی ضرورت تو تسلیم کرتے ہیں، مگر اصطلاح سازی کے مخالف ہیں، پوچھا جاتا ہے کہ اصطلاحات کی ضرورت تو مسلم ہے مگر جدید الفاظ کا بنانا آپ کے نزدیک ممنوع ہے۔ تو پھر اس ضرورت کو پورا کرنے کی تدبیر کیا کی جائے؟ اس کا جواب حضرات مذکور یہ دیتے ہیں کہ انگریزی زبان کی علمی اصطلاحات قبول کر لینی چاہئیں۔ پھر جب ان سے کہا جاتا ہے کہ انگریزی زبان کے الفاظ ایسے کرخت اور ثقیل ہیں کہ ہماری زبانوں پر آسانی سے رواں نہیں ہو سکتے تو اس کے جواب میں وہ فرماتے ہیں کہ تم ان الفاظ کو بازاریوں اور جاہلوں کے سامنے بولو اور ان سے درخواست کرو کہ وہ ان الفاظ کو دہرائیں۔ ظاہر ہے کہ وہ الفاظ مذکور کو بجنسہٖ نہیں بول سکتے۔ پس ضرور ہے کہ ان میں تغیر وتبدل کریں اور ان کو اپنی زبان کی خیراد پر چڑھائیں پھر جو تلفظ ان الفاظ کا وہ کریں اس کو سن کر محفوظ کر لو اور سمجھو کہ انگریزی زبان کے الفاظ کو اپنی زبان میں داخل کرنے کا یہی موزوں اور مناسب طریقہ ہے۔

اس موقع پر اگر میں یہ کہوں کہ یہ بزرگوار زبان کا صحیح ذوق نہیں رکھتے تو کچھ بیجا نہ ہوگا ان بزرگواروں کو جاننا چاہیے کہ انگریزی زبان میں علمی الفاظ کی اس قدر کثرت ہے کہ اگر

www.kitaabistan.com

ان سب الفاظ کو ہم بگاڑ کر اور جاہلوں کی زبان کی خیر اد پر چڑھا کر اپنی زبان میں داخل کر لیں، تو ہماری زبان کا قدرتی حسن و جمال اور اس کے خط و خال کی قدرتی خوبیاں سب خاک میں مل جائیں گی۔ ان حضرات کو یاد رکھنا چاہیے کہ ہر مہذب اور شائستہ زبان میں ایسے الفاظ جو اجنبی زبانوں سے لہجہ یا تلفظ کی تبدیلی یا حروف کی کمی و بیشی کے ساتھ لیے جاتے ہیں، بمقابلہ اس زبان کے اصلی الفاظ کے بہت کم ہوتے ہیں۔ کسی متمدن قوم کی زبان ان الفاظ کی کثرت کو برداشت نہیں کر سکتی۔ اجنبی زبان کے الفاظ کی کیسی ہی تراش خراش کیوں نہ کی جائے، ان میں اجنبیت کی بو اس قدر باقی رہتی ہے کہ اہلِ زبان ان سے مانوس نہیں ہوتے ہماری زبان میں موجودہ اصلی الفاظ کی تعداد ہی بمقابلہ مہذب زبانوں کے کم ہے اگر انگریزی زبان کے تمام علمی الفاظ توڑ مروڑ کر اس میں بھر دیے جائیں تو ان کی تعداد اصلی الفاظ سے بھی زیادہ ہو جائے گی اور ہماری زبان کی لچک اور نزاکت سب ملیامیٹ ہو جائیگی اور ہم ایسی زبان بولنے اور لکھنے پر مجبور ہوں گے، جس کے الفاظ کا کوئی جز گوش آشنا و مانوس نہ ہوگا۔ برخلاف اس کے اگر ہم انگریزی زبان کے علمی الفاظ کے مقابلہ میں ایسے الفاظ وضع کریں جن کے اجزا پہلے سے گوش آشنا اور مانوس ہوں تو اس سے نہ تو زبان کی سلاست اور لوچ میں فرق آئے گا، اور نہ ہم اپنی زبان میں کسی ناگوار مداخلت کے جرم کے مرتکب ہوں گے۔

وضع اصطلاحات کے متعلق عام فیصلہ

خدا کا شکر ہے کہ جامعہ عثمانیہ دکن کی اس جنرل کمیٹی نے جس میں زبان اور علم کا صحیح مذاق رکھنے والے بزرگ شامل تھے، یہ اہم مسئلہ کثرت رائے سے طے کر دیا ہے کہ انگریزی زبان کی اصطلاحیں بجنسہٖ یا کسی تغیر و تبدل کے ساتھ اردو زبان میں نہ لی جائیں بلکہ انگریزی علمی اصطلاحات کے مقابلے میں اردو علمی اصطلاحات وضع کی جائیں۔ اس بنا پر ان حضرات کے خیالات، جو اصطلاح سازی کے مخالف ہیں، اب زیادہ قابلِ توجہ اور لائقِ بحث نہیں رہے۔

اصطلاح سازی کے دو بڑے گروہ

اردو زبان میں اصطلاح سازی کی ضرورت تسلیم کرنے کے بعد یہ مہتم بالشان بحث پیش آتی ہے کہ اگر ہم اصطلاحیں بنائیں تو کس اصول کے مطابق بنائیں۔ اس مرحلہ پر پہنچ کر اصطلاح سازوں کے دو بڑے گروہ ہو گئے ہیں ایک گروہ کی رائے یہ ہے کہ تمام اصطلاحی الفاظ عربی زبان سے بنانے چاہئیں۔ دوسرے گروہ کی رائے یہ ہے کہ اصطلاحات کے وضع کرنے میں ان تمام زبانوں کے لفظوں سے کام لینا چاہیے جو اردو زبان میں بطور عنصر کے شامل ہیں (یعنی عربی، فارسی، ہندی)، اور ان لفظوں کی ترکیب میں اردو گرامر سے مدد لینی چاہیے۔

گروہِ اوّل کے دلائل

پہلا گروہ اپنے نظریے کی تائید میں حسبِ ذیل دلائل پیش کرتا ہے۔

(اوّل) عربی زبان مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے اور اس سبب سے وہ تمام مسلمان قومیں جو دنیا کے مختلف حصوں میں آباد ہیں اس زبان سے یکساں طور پر مانوس ہیں۔ اگر اس زبان کے الفاظ سے اسی زبان کے قواعد کے مطابق علمی اصطلاحیں بنائی گئیں، تو دنیا کے تمام مسلمان ان کو آسانی اور دلچسپی کے ساتھ قبول کر لیں گے اور جس طرح یورپ کی علمی زبان تمام ممالک یورپ کے لیے ایک بین قومی زبان ہے، اسی طرح ہماری علمی زبان بھی تمام بلادِ اسلامیہ کے لیے ایک بین قومی زبان ہوگی۔

(دوم) عربی زبان پہلے سے علمی زبان ہے۔ مسلمانوں کے تمام علمی کارنامے جو انھوں نے زمانۂ سابق میں سرانجام دیے تھے۔ اس زبان میں جمع ہیں اگر جدید علمی اصطلاحیں بھی اس زبان کے الفاظ سے اور اسی زبان کے قواعد کے مطابق وضع کی جائیں تو اس میں کافی قابلیت اس امر کی موجود ہے۔

پہلی دلیل بلاشبہ نہایت موثر اور مسلمانوں کے جذبات کو کھینچنے والی ہے۔ عربی زبان میں مذہبی تعلیم رائج ہونے کے سبب ہر ایک مسلمان قوم اور ہر ایک اسلامی ملک

میں اس زبان کے جاننے والے موجود ہیں۔ محض اس لحاظ سے عربی زبان میں تمام مسلمان قوموں کی مشترک مذہبی زبان ہونے کی قابلیت بیشک موجود ہے۔ اگر یہ ممکن ہوتا کہ یہ زبان تمام مسلمانانِ عالم کی مشترک علمی زبان بھی بن سکے تو ہماری خوش قسمتی میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ اور اس صورت میں تمام علوم وفنون نہایت آسانی اور سہولت کے ساتھ مسلمانوں کی ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل ہو سکتے تھے، مگر افسوس ہے کہ ہماری یہ آرزو پوری نہیں ہو سکتی۔

لاطینی اور یونانی وہ علمی زبانیں ہیں۔ جن کے لفظوں اور ترکیبوں سے اہلِ یورپ نے علمی اصطلاحات بنائی ہیں۔ یہ دونوں زبانیں آریائی خاندان کی زبانیں ہیں۔ مگر عربی زبان اس خاندان کی زبان نہیں ہے۔ بلکہ اس کا تعلق سامی خاندان سے ہے۔ آریائی اور سامی خاندانوں میں الفاظ کے بنانے کے جدا جدا قاعدے ہیں، آریائی خاندان کی زبانوں میں مرکب الفاظ بنانے اور ان الفاظ سے پھر نئے الفاظ مشتق کرنے کے خاص قاعدے ہیں اور یہی وہ چیز ہے جس کی ضرورت علمی اصطلاحات میں پیش آتی ہے۔ سامی زبانوں میں یہ قاعدے نہیں ہیں۔ اس لیے مرکب الفاظ اور ان کے مشتقات کو معرّب کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے اس وقت جبکہ یونانی زبان سے عربی زبان میں علمی کتابیں ترجمہ کی گئیں، علمی ذخیرہ بہت کم تھا اور مرکب الفاظ کی تعداد بھی کم تھی۔ تاہم ہزاروں الفاظ معرّب کیے گئے اور اسی پر قناعت کر لی گئی۔ آج کل علوم کی تعداد یورپ میں بہت بڑھ گئی ہے اور ہر علم سے بہت سی شاخیں اور ان شاخوں سے بہت سی کونپلیں نکل آئی ہیں۔ اس تمام ذخیرہ میں مرکب الفاظ اور ان کے مشتقات کی بھرمار اس قدر ہے کہ عربی زبان میں نہ تو یہ قابلیت ہے کہ ان سب کے مقابلہ میں ویسے ہی الفاظ بنا سکے اور نہ اس کی فصاحت اس بات کا تحمل کر سکتی ہے کہ ایسے تمام الفاظ کو معرّب کر کے داخلِ زبان کر لیا جائے۔

عربی زبان کی قدرتی بناوٹ پر غور کرنے والا آسانی سے اس نکتہ کو سمجھ جائے گا کہ اس زبان میں مفرد مادّے تو کثرت سے ہیں، مگر ترکیب کے لحاظ سے اس میں وہ لچک نہیں ہے جو یورپ کے علوم وفنون کو ان زبانوں میں منتقل کرنے کے لیے کافی ہو، مصری اور شامی اور

خود عرب ہماری نسبت اپنی زبان کے رموز کو اچھی طرح سمجھتے ہیں وہ اسی وجہ سے کوئی ضابطہ وضع اصطلاحات کا قائم نہ کر سکے اور عملاً یہ فیصلہ انھوں نے کر دیا کہ عربی زبان یورپ کی جدید علمی اصطلاحات کے مقابلہ میں ویسی ہی علمی اصطلاحات بنانے کی قوت نہیں رکھتی۔ اب ہم کو اس بات کی توقع رکھنے کا کیا حق ہے کہ اصطلاح سازی میں تنہا اس زبان کے الفاظ اور اس کے قواعد اشتقاق کافی ہو سکتے ہیں۔ اگر یہ لچک عربی زبان میں موجود ہوتی، تو عربی زبان بولنے والے نہایت آسانی سے وضع اصطلاحات میں پیش قدمی کرتے۔

پہلی دلیل میں جو مثال لاطینی اور یونانی کی دی گئی ہے، وہ کسی طرح صحیح نہیں ہے کیوں کہ لاطینی اور یونانی وہ زبانیں ہیں۔ جو یورپ کی تمام زبانوں کا سرچشمہ ہیں۔ یونانی اور لاطینی کے بے شمار مادّے یورپ کی زبانوں میں ادل بدل کر شامل ہو گئے ہیں اس کے علاوہ بڑی بات یہ ہے کہ یورپ کی زبانوں اور لاطینی اور یونانی زبان کی کمپیریٹو گرامر (نحو بالمقابلہ) ایک ہے، اس لیے کہ یہ تمام زبانیں آریائی خاندان کی ذیل میں داخل ہیں۔ برخلاف اس کے ایران، افغانستان۔ ترکستان۔ چین۔ روس اور ملایا کے مسلمان جو فارسی۔ پشتو۔ ترکی۔ چینی روسی اور ملائی زبانیں بولتے ہیں وہ اس خاندان السنہ سے کچھ تعلق نہیں رکھتیں۔ جس میں عربی زبان شامل ہے۔ ان زبانوں کی بناوٹ عربی زبان کی بناوٹ سے بالکل مختلف ہے اور عربی کی گرامر ان زبانوں کی گرامر سے کوئی مشابہت نہیں رکھتی۔ اس بنا پر جس طرح یونانی اور لاطینی تمام یورپ کے لیے ایک بین قومی علمی زبان بن گئی ہے۔ اس طرح عربی زبان تمام بلادِ اسلامیہ کے لیے مشترک علمی زبان نہیں بن سکتی۔ عراق۔ شام۔ عرب۔ مصر اور شمالی افریقہ میں البتہ عربی زبان یا اس سے نکلی ہوئی بولیاں بولی جاتی ہیں۔ صرف ان ملکوں کے لیے عربی زبان ایک مشترک علمی زبان بن سکتی ہے۔

دوسری دلیل میں جو اس بات کا اشارہ کیا گیا ہے کہ زمانۂ سابق میں علوم کی اصطلاحیں عربی سے لی گئی ہیں یہ صحیح ہے مگر ہمارے بزرگوں کا ایسا کرنا ایک خاص وجہ پر مبنی تھا اور وہ وجہ اب نہیں پائی جاتی۔ یونانی زبان سے علوم کا ترجمہ عربی زبان میں اس قوم نے کیا، جو عربی زبان بولتی اور عربی ہی میں تعلیم وتعلم کا کام انجام دیتی تھی۔ اس کے بعد جب یہ علوم ایران اور ہندوستان

وغیرہ ملکوں میں آئے تو ذریعہ تعلیم پھر بھی عربی زبان رہی۔ چناں چہ ہمارے عربی مدارس میں اب تک بھی یہی زبان ذریعۂ تعلیم ہے۔ اس لحاظ سے تمام علمی اصطلاحات کا عربی زبان میں ہونا اور ان کا اس زبان کی ساخت اور گرامر کے مطابق ہونا ضروری اور مناسب تھا مگر اب ہم اردو زبان کو ذریعۂ تعلیم قرار دے رہے ہیں اور اسی زبان میں یورپ کے تمام علوم و فنون کو منتقل کرنا چاہتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ بات نہایت ضروری ہے کہ جو نئی علمی اصطلاحات وضع کی جائیں، وہ اردو زبان کی قدرتی ساخت اور گرامر کے مطابق ہوں۔

غرضکہ دونوں دلیلیں جو گروہِ اول کے نظریہ کی حمایت میں پیش کی گئی ہیں، وہ اگرچہ دل خوش کن ضرور ہیں مگر عملاً بیکار ہیں۔

گروہِ ثانی کے دلائل

دوسرے نظریہ کی تائید میں جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ بطور اختیار کے ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

(۱) کسی زبان کی ترقی کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ اس زبان میں غیر زبانوں کے بے شمار الفاظ بجنسہٖ مابعد تصرف کے داخل کر لیے جائیں زبان کی ترقی اسی حالت میں ترقی کہلا سکتی ہے۔ جب کہ وہ اکثر الفاظ جو اس میں بڑھائے جائیں، اس زبان کی قدرتی ساخت اور اس کی اصلی گرامر کے مطابق بنائے گئے ہوں اور ان الفاظ کے مادّے ان زبانوں سے لیے گئے ہوں جو اس زبان کی بناوٹ اور ترکیب میں قدرتی طور سے دخل رکھتی ہوں۔ پس اردو زبان میں علمی اصطلاحات وضع کرنا اسی حالت میں اس زبان کی ترقی کا باعث ہو سکتا ہے جب کہ اس اصول پر عمل کیا جائے۔

(۲) عربی زبان میں بلاشبہ مفرد مادّوں کی افراط ہے اور اس لحاظ سے یہ زبان ایک اعلیٰ درجہ کی زبان ہے مگر جب کہ اردو زبان کے قدرتی عنصر عربی، فارسی اور ہندی زبانیں ہیں تو ان میں سے کسی ایک زبان پر قناعت کر لینا اپنے لیے تنگی پیدا کرنا اور ترقی کے دائرہ کو محدود کر دینا ہے۔ ہمارے لیے آسانی اور سہولت اسی میں ہے کہ ہم جو نئے الفاظ بنائیں ان کے

مادّے تینوں زبانوں سے لیں اور اپنی زبان کو ترقی کی اسی طبعی رفتار پر آگے بڑھنے دیں، جس پر کہ وہ آج تک چلتی اور آگے بڑھتی رہی ہے۔

(۳) اردو زبان ہندوستان کے مختلف گروہوں نے مل کر بنائی ہے اور فہم و تفہیم کی آسانی کے لیے ہر گروہ نے اپنی زبان کے الفاظ اس زبان میں شامل کیے ہیں اور اس طرح یہ زبان ان تمام گروہوں کے لیے ذریعۂ فہم و تفہیم بن گئی ہے۔ اگر ہم کسی ایک گروہ کی زبان مثلاً عربی کے الفاظ اس میں کثرت سے شامل کریں، تو دوسرے گروہوں کے لیے وہ ذریعۂ فہم و تفہیم نہیں رہے گی اور اس زبان کی اس خاص قابلیت میں خلل آجائے گا جس کے سبب وہ تمام ہندوستان کے لیے مشترک زبان مان لی گئی ہے۔

(۴) ہندوستان میں مدتِ دراز سے دو زبانیں ذریعۂ تعلیم رہی ہیں۔ ہندوؤں کے لیے سنسکرت اور مسلمانوں کے لیے عربی۔ اسی سبب سے دو مختلف قسم کی علمی اصطلاحیں اب تک اس ملک میں مستعمل ہوتی رہی ہیں۔ ہندوؤں نے اپنی تعلیمی کتابوں میں سنسکرت کی اصطلاحیں درج کی ہیں اور اپنی قوم کے طلبا کو انھیں اصطلاحوں میں تعلیم دی ہے برخلاف اس کے مسلمانوں نے تمام علمی اصطلاحیں عربی زبان سے ماخوذ کی ہیں اور ذریعۂ تعلیم انھیں اصطلاحوں کو قرار دیا ہے۔ مگر اب ہم اردو زبان کو ذریعۂ تعلیم ٹھہرانا چاہتے ہیں۔ اس بنا پر نہ تو ہم یہ چاہتے ہیں کہ سنسکرت کی اصطلاحوں سے اپنی زبان کو بوجھل کریں اور مسلمانوں کے لیے مشکلات پیدا کریں اور نہ اس بات کو مناسب سمجھتے ہیں کہ تنہا عربی سے تمام اصطلاحیں لے کر ہندوستان کے دوسرے گروہوں کے لیے اپنی زبان کو نامانوس اور اجنبی ہونے دیں۔ ہمارے نزدیک مناسب طریقہ یہ ہے کہ اصطلاحیں وضع کرنے میں ان تمام زبانوں سے کام لیا جائے جو اس زبان کی ترکیب میں طبعی طور پر شامل ہیں۔ ہم کو یقین ہے کہ ایسا کرنے سے تعلیم میں آسانی اور سہولت پیدا ہوگی۔

نہایت خوشی کی بات ہے کہ جامعہ عثمانیہ کی اس کمیٹی نے جس میں دونوں گروہ کے مناسب الرائے موجود تھے کافی غور اور مباحثہ کے بعد کثرت رائے سے دوسرے گروہ کے نظریہ کو پاس کر دیا ہے کہ اردو زبان میں جو علمی اصطلاحیں وضع کی جائیں ان کے لیے

الفاظ عربی. فارسی اور ہندی سے بے تکلف لے جائیں مگر الفاظ کی ترکیب دینے کے وقت صرف اردو زبان کی گرامر کا لحاظ رکھا جائے. اور کسی زبان کی گرامر کا نہیں. ارباب کمیٹی نے اپنے اس فیصلہ میں اس نکتہ کو ملحوظ رکھا ہے کہ اگر علمی الفاظ کسی خاص زبان مثلاً عربی یا فارسی یا ہندی زبان سے اسی زبان کی گرامر کے بنائے جائیں گے. تو وہ اردو زبان کے الفاظ نہ ہوں گے. بلکہ عربی. فارسی یا ہندی زبان کے الفاظ ہوں گے. کسی زبان کے الفاظ بھی اردو زبان کے الفاظ کہلانے کے مستحق نہیں ہیں. جب تک کہ ان پر اردو گرامر کا سکہ لگانے کی قابلیت نہ ہو یا ان پر اردو گرامر کا سکہ نہ لگا دیا گیا ہو. دوسرے لفظوں میں اس فیصلہ کا مطلب یہ ہے کہ جدید الفاظ اردو زبان میں خود اس زبان کی قدرتی ساخت کے مطابق بنائے جائیں. نہ کہ اور کسی اجنبی زبان کی بناوٹ اور قواعد کے مطابق.

ابوالفیض سحر

اردو سے ہندی ترجمے کے مسائل

۱۔ ترجمے کی ضرورت اور اہمیت

ترجمے کی ضرورت اور اہمیت و افادیت کا دنیا کے ہر گوشے کے ہر علمی حلقے نے پوری طرح اعتراف اور اقرار کیا ہے. یورپ کا نشاۃ الثانیہ، اس انقلاب آفریں علمی روایت کی آفاقی افادیت کا سب سے بڑا تاریخی ثبوت ہے ساتھ ہی اقوام و ملل کی زندگیوں میں رونما ہونے والے نشیب و فراز کی داستانوں کا سب سے زیادہ تابندہ نقش ہے اور شعور و فکرِ انسانی کے سفر کا سب سے بڑا سنگ میل بھی. علمی ادبی سائنسی اور فنی و فکری منطقوں کے ساتھ ساتھ عام زندگی میں سرکاری اور غیر سرکاری زمروں میں بھی آئے دن ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے. ہندوستان میں تو ہندی اور اردو کا صدیوں سے چولی دامن کا ساتھ ہے. ان کی ترقی اور ترویج کے لیے دو مختلف اور متحارب سمتوں کی بجائے متوازی، ممد و معاون، خطوط وضع کیے جانے ضروری ہیں. یہی ہمارے ملک اور ہمارے عہد کا سب سے بڑا لسانی تقاضا ہے.

ہر شخص جانتا اور مانتا ہے کہ اردو اور ہندی، ہندوستان کی دو اہم قومی زبانیں ہیں. ان کا، بین الاقوامی دائروں سے قطع نظر، ملک کے اندر ہر حصے میں شب و روز کا ساتھ رہتا ہے اب جبکہ ہندی کے قومی سرکاری زبان کی حیثیت سے نفاذ کے بعد، اردو کو بھی بعض ریاستوں میں سرکاری اغراض کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے تو اردو سے ہندی اور بعض صورتوں میں ہندی سے اردو میں ترجمے کی ضرورت کو شدت سے محسوس کیا جانے لگا ہے. ہر چند کہ کوشش ناکام نہیں لیکن نئے حالات اور نئے سیاق و سباق میں اس ضرورت کو عصری تقاضوں

کے ساتھ محسوس کرنا چاہیے۔ اب اس سلسلے کے درپیش مسائل کو کسی تحفظِ ذہنی کے بغیر، گہرے خلوص اور نئے لسانی شعور سے، بلا کسی تامل و تاخیر کے، حل کرنا ہوگا۔

۲۔ ترجمے کا فن

ترجمہ بنیادی طور پر انسانی سماج کی ایک لسانی اور علمی ضرورت ہے۔ بولیاں اور زبانیں اظہارِ خیال کا ذریعہ ہوتی ہیں اور رسم الخط اس کا ایک مربوط اور منظم وسیلہ ہوتا ہے۔ مختلف زبانوں کے بولنے سمجھنے والے دو افراد یا دو گروہوں یا دو سماجوں میں تبادلۂ خیال کا واحد ذریعہ ترجمہ ہی ہے۔ اسا سی طور پر اسے سبک، رواں اور عام فہم ہونا چاہیے تاکہ اظہارِ خیال اور تبادلۂ خیالات کا اصل مقصد حاصل ہو۔ اس کام کے لیے مترجم کو دونوں زبانوں پر عبور حاصل ہونا چاہیے۔ جس زبان میں ترجمہ کیا جاتا ہے اس کا تو مترجم کو گہرا علم اور ادراک چاہیے ہی ورنہ وہ ایک کامیاب مترجم ثابت نہیں ہو سکتا۔ اچھا اور عمدہ ترجمہ اپنے آپ بھی ایک فن کا بھی درجہ رکھتا ہے۔ ترجمے کئی طرح کے ہوتے ہیں لیکن ان کا True to the Text ہونا نہایت ضروری ہے۔ ان اقسام کی مختصر طور پر مندرجہ ذیل انداز میں تشریح کی جا سکتی ہے

(ا) لفظی ترجمہ۔ یہ ایک عام روایتی اور رسمی ترجمہ ہوتا ہے جس میں عبارت اور مفہوم و مطالب کے گہرے احساس اور شعور کے بغیر سرسری طور پر بلکہ سطحی طور پر لفظ بہ لفظ ترجمہ کیا جاتا ہے۔ مجموعی حیثیت سے اسے ایک ناقص ترجمہ ہی سمجھا جاتا ہے۔ ایسے ترجمے اکثر گنجلک اور ناقابلِ فہم ہوتے ہیں۔

(ب) بامحاورہ ترجمہ۔ یہ ایسا ترجمہ ہوتا ہے جس میں مترجم ترجمے کے تقاضوں کو محسوس کرتے ہوئے ترجمے کے اصول و ضوابط کا لحاظ رکھتا ہے۔ اس ترجمے میں زبان اور بیان کے لسانی شعور و احساس کے دوش بدوش لغت اور قواعد اور پیرائے اظہار کے دوسرے ادبی پہلوؤں کو بھی سامنے رکھا جاتا ہے۔ یہی صحیح اور کامیاب ترجمہ ہوتا ہے۔

(ج) آزاد ترجمہ۔ یہ ترجمے کی ایک خاص قسم ہے جس میں ترجمہ True to the Text نہیں ہوتا بلکہ فکر و خیال کی کچھ آزادی کے ساتھ ساتھ پیرائے اظہار و بیان میں بھی

آزادی برتی جاتی ہے اور انشا پردازی کا سہارا لیا جاتا ہے جس کے نتیجے میں فنکارانہ انداز پیدا ہو جاتا ہے ایسے ترجمے بالعموم خام اور ناقص ہوتے ہیں مگر یہ لسانی اور ادبی خصوصیات کی وجہ سے روا رکھے جاتے ہیں۔

(د) متنی حقیقی ترجمے۔ قانونی، عدالتی اور سرکاری معاملات میں تو ترجمے کا بنیادی طور پر True to the Text ہونا شرطِ اولین ہے۔ اس لیے اس میں کافی محتاط رہنا پڑتا ہے اس میں نہ صحافتی انداز اختیار کیا جا سکتا ہے اور نہ روا روی میں ترجمہ لفظی یا سرسری ڈھنگ سے کیا جا سکتا ہے۔ اس میں الفاظ، محاوروں اور جملوں کے تانے بانے کو بھی معنی و مفہوم کے سیاق و سباق میں پوری ہوش مندی سے سمجھنا اور پوری ذمہ داری سے دوسری زبان میں منتقل کرنا پڑتا ہے۔ یہ ایک طرح سے Craft کا کام ہوتا ہے اس لیے ہم انھیں متنی حقیقی ترجمے کہہ سکتے ہیں جو متن کے حقیقی معنی و مفہوم کے چوکھٹے متجاوز نہیں ہو سکتے۔

اس طرح بہ حیثیت مجموعی ہم کہہ سکتے ہیں کہ ترجمے کا فن Art بھی ہے اور Craftt بھی۔

۳۔ اردو اور ہندی کا رشتہ

دنیا میں کم زبانیں ایسی ہوں گی جو ایک دوسرے کے اتنی قریب ہوں جیسے اردو اور ہندی ہیں۔ ہندوستان میں کوئی بھی زبان ہندی سے اتنی قریب نہیں جتنی اردو ہے۔ بجز رسم الخط کے۔ ان دونوں میں جو گہرا لسانی تعلق اور رشتہ ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔ ہندی، دراصل اردو ہی کا ابتدائی نام تھا اور موجودہ ہندی کو بھاکا کہا جاتا تھا۔ بات کو مکمل کرنے اور اجمالی طور پر جائزہ لینے کے لیے ہم اردو اور ہندی کے اس رشتہ کو ذیل کی مشقوں میں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ ترجمے کا فنی رمز اور اس کا شعور واضح ہو سکے۔

(ا) لسانی سطح۔ دونوں زبانوں کا جنم ہند آریائی زبانوں کے خاندان میں ہوا اس طرح دونوں ہندوستان ہی میں پیدا ہوئیں پھلی پھولیں اور پروان چڑھیں۔ اختصار سے کام لیں تو

یہ کہا جاسکتا ہے کہ دونوں کا لسانی ماخذ، سنسکرت کی کوکھ اور اپ بھرنش کی گود اور دیگر مقامی بولیوں کے دامن سے وابستہ ہے۔ جو پنجاب، ہریانہ اور دوآبے کی تہذیبی اور لسانی تاریخ کا ورثہ ہے۔ ان کا یہ لسانی سفر کبھی اونچے طبقات سے نیچے کے طبقات تک رہا۔ تو کبھی نیچے کے طبقات سے اوپر کی طرف رہا۔ بڑی اجتماعی لہروں کے ساتھ ساتھ، چھوٹی انفرادی لہروں نے بھی اپنا کردار ادا کیا ہے جسے ہم جامعیت کے ساتھ ہند آریائی لسانی مدوجزر کا نام دے سکتے ہیں۔ اس مدوجزر سے ان کی لسانی ساخت و پرداخت ہوئی اور زبانوں کی شکل و صورت بنی اور خدوخال واضح ہوئے لیکن رفتارِ زمانہ کے ساتھ ساتھ ان دونوں زبانوں میں، پیدائشی یکسانیت کے باوجود بناؤ سنگھار کے دوران، کچھ مختلف قسم کے زیوروں سے بھی آراستگی ہوتی گئی۔ یہ عمل ہنوز جاری ہے۔

(ب) قواعدی سطح :- اردو اور ہندی چونکہ بنیادی طور پر ایک ماں کے بطن سے پیدا ہوئیں دو جڑواں بہنیں ہیں۔ اس لیے ان کی گرامر اور قواعد بڑی حد تک ایک ہی ہیں۔ لفظ کے بعد، زبان کے لسانیاتی اظہار کا دوسرا قدم کلمہ یا جملہ ہوتا ہے۔ جو بامعنی الفاظ کی ایک خاص ترتیب ہوتی ہے جسے ہم قواعدِ زبان کہتے ہیں۔ اجزائے کلام کی ترتیب، فاعل، فعل اور مفعول کی نشست ایک عام ترتیب بھی ہے اور ایک خاص ترتیب بھی۔ جس سے یہ دونوں زبانیں، اپنی پہچان بناتی ہیں۔ زبان کے ان قواعد سے ترجمے میں آسانی ہی نہیں ہوتی بلکہ بڑی مدد بھی ملتی ہے۔

(ج) اظہار و بیان کی اسلوبیاتی سطح :- اردو اور ہندی اگرچہ بنیادی طور پر ایک ہی زبان کے دو روپ یا شیلیاں ہیں مگر بہ نظرِ غائر جائزہ لیا جائے تو ان میں ابتدائی زمانے سے لے کر آج کے عہد تک اظہار و بیان کی اسلوبیاتی سطحوں پر کچھ مختلف خصوصیات بھی رونما ہو گئی ہیں۔ پالی پراکرت اور ابھرنش کے زمانے کے بعد یہ نقوش، سیاسی، سماجی اور تہذیبی آویزش اور آمیزش کی وجہ سے دھیرے دھیرے واضح ہوتے گئے حالانکہ دکنی زبان (اردو کے قدیم) کے دور تک یہ خصوصیات بڑی حد تک مشترک رہیں اور گنگا جمنی کردار سے متصف رہیں لیکن بعض طبقات کی خصوصی رویوں اور رجحانوں کے باعث ایک طرف عربی اور فارسی کے لسانی

اثرات مرتب ہوتے گئے تو دوسری طرف سنسکرت اور برج وغیرہ کے لسانی اثرات جڑ پکڑتے گئے۔ اس طرح زبانوں، علاقوں اور تہذیبی بنیادوں کے فرق کے پہلو بہ پہلو، زبان ادب اور فن پاروں کی شناخت اور پہچان میں بھی فرق پیدا ہوتا گیا۔ روزمرہ، محاورے، کہاوتیں شاعری، افسانوں اور کہانیوں کے بدلتے ہوئے تہذیبی تناظر اور علمی و فکری روایات کے بدلتے ہوئے موسموں اور مزاجوں نے بھی اظہار و بیان کے اسالیب کو متاثر کیا۔ چنانچہ اب اردو اور ہندی عام بول چال کی زبان سے ہٹ کر علمی و ادبی زبان اور ان کے اسالیب اور پیکر ایک دوسرے کے ہمزاد کی طرح ملے ہوئے ہونے کے باوجود بھی کچھ بدلے ہوئی ضرور محسوس ہوتے ہیں۔ اس لیے ترجمے کے دوران ان امور کو بھی لازمی طور پر پیش نظر رکھنا ہوگا۔

(د) اصطلاحات کے استعمال کا معاملہ :- کسی بھی زبان میں، الفاظ اور کلمات کے بعد اصطلاحات اور تراکیب کو بھی خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ بولیوں اور عام بول چال کی زبانوں میں یہ مسئلہ زیادہ پریشان کن نہیں ہوتا مگر علمی سطح پر علمی شعبوں میں مختلف مضامین اور مختلف افکار و خیالات کو پیش کرنے کے لیے علمی اصطلاحات درکار ہوتی ہیں۔ یہ معاملہ زبان کے لسانی ڈھانچے اور ذخیرۂ الفاظ کے ساتھ جڑا ہوا ہوتا ہے۔ اردو اور ہندی اس میدان میں، کچھ فاصلے پر کھڑی نظر آتی ہیں۔ ہندی والوں نے اپنے لسانی تشخص اور لسانی مجبوریوں کی وجہ سے سنسکرت کو سرچشمۂ حیات بنا رکھا ہے۔ تو دوسری طرف اردو والوں نے اپنی لسانی پہچان اور علمی اصطلاحات کی توضیع کے لیے عربی اور فارسی کا دامن پکڑ رکھا ہے۔ یہ شاید دونوں زبانوں کے موجودہ مروجہ ڈھانچے اور مزاج کا جبر ہے۔ کیونکہ علمی اصطلاحات کے لیے مادّے اور مشتقات پھر ان سے بننے والے ذیلی اور اضافی جوڑ، پھر مناسب سابقوں (سابقہ وہ حرف یا لفظ ہوتا ہے جو کسی اصطلاح کے آگے / پہلے لگتا ہے۔ جیسے علم سے لاعلم، دین سے بے دین، اور لاحقوں (لاحقہ وہ حرف یا لفظ ہوتا ہے جو کسی اصطلاح کے پیچھے / بعد میں لگتا ہے۔ جیسے پاک سے پاک باز، راست سے راست باز) سے حاصل ہونے والے مرکبات اور مجموعات الفاظ اور تراکیب، بنیادی ضرورت بن کر سامنے آتے ہیں۔ جو از خود بھی متعلقہ زبان کی ساخت اور اس کے مزاج کے آہنگ کے تقاضوں کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ جیسے ہندی میں:

ترجمے کا کام کرتے وقت ان باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ اچھے اور جامع ترجمے کے لیے صحیح متبادل اصطلاحات اور تراکیب وغیرہ کا استعمال ناگزیر ہے۔ ان کے علاوہ زبان کے مزاج اور اس کے تہذیبی ورثہ کو سمجھنا بھی ازحد ضروری ہے تاکہ انتقال مفہوم و مطلب میں کوئی لغزش یا کوتاہی نہ ہونے پائے اور عبارت میں شتر گربگی بھی پیدا نہ ہو۔

۴۔ لسانیاتی مسائل

ترجمہ خواہ اردو سے ہندی میں کیا جائے یا ہندی سے اردو میں اس عمل میں بعض لسانیاتی مسائل سے ہمیں ضرور دوچار ہونا پڑتا ہے۔ جو بظاہر چھوٹے اور غیر اہم معلوم ہوتے ہیں مگر ان کی تکنیکی نوعیت کی وجہ سے وہ سنجیدہ توجہ کے طلب گار ہیں۔ ان پر بھی مختصر سی ہی سہی مگر مرحلہ وار انداز میں توجہ کرتے چلیں تاکہ مسائل کی نشاندہی ہو سکے اور ان کے حل کی بھی کوئی صورت سامنے آسکے۔

(الف) حروف تہجی :۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ اردو اور ہندی ایک ماں کی کوکھ سے جنم لینے کے باوجود حروف تہجی کے سلسلوں میں بہت مختلف ہیں۔ اور مختلف نظام اصوات پر بھی مبنی ہیں۔ آیئے لغوی اور صرفی و نحوی مباحث اور حروف تہجی سے متعلق صوتیاتی خصوصیت تعدد اور تکرار کی صورتوں کی طرف بھی کچھ اشارے کرتے چلیں۔ ہندی کی ہکار آوازوں کو ہم علیحدہ حروف تہجی کی شکل دے کر، اردو کے اساسی حروف تہجی کی تعداد میں غیر ضروری اضافہ کرنے کا جوکھم اٹھائے بغیر، سائنٹیفک ڈھنگ سے ہی، ھ کی مدد سے متعلقہ حرف کے ساتھ جوڑ کر، کام چلا سکتے ہیں۔

اس اختلاط کی کسی ماہر زبان کے ہاں دس صورتیں ہیں تو کوئی ماہر لسانیات تیرہ کی بات کرتا ہے مگر ہے تو ان کا مناسب اور موزوں و کامیاب حل۔ اس کے برخلاف، ہندی کے دیوناگری رسم الخط میں اردو کے و، آ، ع، ت، ط۔ ز، ذ، ض، ظ۔ ث، س، ص۔ خ، ک۔ ق وغیرہ کی اصوات کو ظاہر کرنے کا مناسب طریقہ یا نشان نہیں ہے۔ اس لیے اتنی بڑی زبان

کا نظام اصوات محدود سا ہو کے رہ گیا ہے۔ لیکن کچھ عرصہ پہلے میں نے سنٹرل ہندی ڈائریکٹوریٹ محکمہ تعلیم حکومت ہند کی مختلف ماہرین کی کمیٹیوں میں، اس سلسلے میں کافی کام کیا تھا۔ دس ہزار الفاظ پر مشتمل، ایک ہندی اردو لغت، हिन्दी उर्दू व्यवहारिक लघु कोश اڈیٹ کیا اور پانچ ہزار ہندی الفاظ کی، ہندوستان کی چودہ مسلمہ قومی زبانوں میں Transliteration سے متعلق ماہرین کی کمیٹی میں ایک رکن کی حیثیت سے شریک رہا اور مناسب تجاویز پیش کیں جنھیں بڑی حد تک قبول بھی کیا گیا۔ اور یہ لغت भारतीय भाषा कोश کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ یوں تو ہندی والے حسب ضرورت ایک بندو (نقطہ) کے اضافے یا استعمال کے لیے بھی تیار نہ ہوتے تھے مگر متذکرہ بالا لغت کی تیاری کے سلسلے میں پیش کردہ تجاویز سے بڑی حد تک اتفاق کیا اور ان کا مسئلہ بھی بڑی حد تک حل ہوا۔ اور یہ لغت شائع ہوئی جس پر حکومت ہند کے سب سے بڑے ہندی کے ادارے کی مہر بھی لگی ہے یہ یقیناً ایک بڑا اور بہت ہی خوش آئند اقدام ہے اس کا خیر مقدم کیا جانا چاہیے۔ کلیدی اہمیت کے اس کام سے اردو ہندی اور ہندی اردو ترجمے Translation اور نقل تلفظ Transliteration میں کافی مدد ملتی ہے۔

اس نئے مجوزہ خاکے کی مدد سے اردو، عربی اور فارسی کی تقریباً سبھی اصوات کو ذرا اسی توجہ سے ہندی کے دیوناگری رسم الخط میں بھی منتقل کیا جا سکتا ہے۔ اس سے الفاظ کے تلفظ، ان کے مادوں اور معنی کا امتیاز برقرار رکھا جا سکتا ہے اور کسی قسم کی غلط فہمی یا گڑبڑ نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح ذلیل کو ذلیل ہی لکھا اور پڑھا جا سکتا ہے۔ جلیل کو جلیل ہی لکھا پڑھا جا سکتا ہے۔ ارض، عرض، غم، غزل، ثابت، صاحب، قبر، خبر، ہاتھ، حج، سب کچھ صحیح صحیح لکھا اور پڑھا جا سکتا ہے۔

اسی طرح اردو الفاظ اور تراکیب کے تلفظات کو ہندی کے دیوناگری رسم الخط میں ظاہر کرنے کے اور مسائل بھی ہیں۔

www.kitaabistan.com

(ب)، روزمرہ، محاورے، کہاوتیں اور تلمیحات :- ہر زبان کی اپنی ایک تہذیبی فضا ہوتی ہے اور ایک وسیع و عریض سماجیاتی پس منظر بھی، جو زبان و ادب کے ہر افق پر نمایاں ہوتا رہتا ہے۔ زبان کے حوالے سے، روزمرہ، محاورے، کہاوتیں، ضرب الامثال، اور تلمیحات وغیرہ دراصل اسی تہذیبی وراثت کے الگ الگ چھوٹے چھوٹے مظاہر کے نام ہیں۔ اردو اور ہندی، ذہنی اساسی خصوصیات کی وجہ سے، اس سرمایہ میں بڑی حد تک ایک دوسرے کی شریک بھی ہیں اور ساجھے دار بھی۔ لیکن یوں بھی ہے کہ اس کا کچھ حصہ مختلف نوعیت، کیفیت اور کمیت کا ہے۔ جو ان کا اپنا دھن اور ان کا اپنا سرمایہ ہے۔ مشترکہ محاوروں، کہاوتوں کو، جوں کا توں برتا اور استعمال کیا جا سکتا ہے۔ جیسے آنکھیں چرانا، چار دن کی چاندنی ہے پھر اندھیری رات، جان جوکھم میں ڈالنا، دن میں تارے نظر آنا، نو دو گیارہ ہونا، اندھیری نگری چوپٹ راج، بات کا بتنگڑ بنانا، بغل میں چھری منہ پر رام رام، وغیرہ وغیرہ لیکن بعض مخصوص تہذیبی سیاق کے محاوروں ضرب الامثال اور تلمیحات کو، جوں کا توں لکھنا زیادہ مناسب نہ ہوگا۔ کیونکہ دوسری زبان یا دوسرے تہذیبی سیاق کے پڑھنے والے محل استعمال کے لحاظ سے مفہوم و مطلب کو پوری طرح نہیں سمجھ سکتے۔

مثلاً

حاتم کے قبر پر لات مارنا، ہفت خواں طے کرنا، پیغمبری وقت، دستِ مولاصفات، جوئے شیر لانا، ہمہ خاندان آفتاب است، پدرم سلطان بود، آگ لینے گئے پیغمبری مل گئی، یا نمازیں بخشوانے گئے، روزے گلے پڑ گئے، وغیرہ ایسی صورتوں میں بہتر صورت یہی ہو سکتی ہے کہ یا تو مفاہیم و مطالب کو سمجھ کر دوسری زبان میں جس میں ترجمہ کیا جا رہا ہو، ان کے متبادل، محاوروں یا تراکیب کو استعمال کیا جائے یا پھر صاف صاف لفظوں میں مطلب بیان کیا جائے۔

(ج)، دفتری اور عدالتی کام :- عام ترجمے یا صحافتی ترجمے، مہارت اور تجربے کے بل بوتے پر، جلدی یا رواروی میں بھی کیے جا سکتے ہیں۔ مگر دفتری کام اور خاص کر عدالتی معاملات

سے متعلق ترجمے خصوصی توجہ، احتیاط اور مضمون میں مہارت اور خاصی دست گاہ چاہتے ہیں اس ضمن میں متعلقہ دفتروں سے متعلق خصوصی روایات اور ہدایات کا بھی پاس و لحاظ رکھنا پڑتا ہے، ہندی میں تو کئی ریاستوں میں سرکاری کام ہوتا ہے۔ اس لیے ان مروجہ اصطلاحوں سے واقفیت حاصل کی جائے اور انھیں استعمال کیا جائے

ایک خاص صورت حال یہ کہ اس سلسلے میں بعض اوقات سرکاری ہدایات اور متعلقہ محکمے کی پالیسیوں کے مطابق وہاں مروجہ اصطلاحات کو ہی استعمال کرنا پڑتا ہے۔ جیسے صدر جمہوریہ کے لیے راشٹرپتی، وزیر اعظم کے لیے پردھان منتری، وزیر اعلیٰ کے لیے مکھ منتری، بجٹ سپریم کورٹ۔ راجیہ سبھا، لوک سبھا وغیرہ بھی اسی زمرے میں آتے ہیں۔ اہلِ زبان، مستعد اور منجھے ہوئے مترجم اپنی معلومات، تجربے اور مہارت سے اس میدان میں بھی خوب صورتی سے اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہوتے ہیں۔

(د)، نثر اور نظم کا ترجمہ :- بالعموم نثری ترجمے آسان ہوتے ہیں۔ اگر زبان و بیان پر قدرت ہو اور دونوں زبانوں کے تہذیبی پس منظر بھی نگاہ میں ہوں تو ذرا سی توجہ تھوڑی سی محنت اور کچھ دل چسپی اور کچھ کوشش سے نثری ترجمے کامیابی سے کیے جا سکتے ہیں۔ البتہ نظم کے ترجمے مشکل ہوتے ہیں۔ نظم سے نظم میں ترجمہ تو دونوں زبانوں میں شاعری کرنے کی صلاحیت اور مشق رکھنے والا ہی کر سکتا ہے۔ اردو نظم کو بعینہٖ ہندی رسم الخط میں منتقل کرنا یا نقل ”ملفظ Transliteration کرنا بھی بہت مشکل ہوتا ہے۔ اگر اس سے پہلے اوپر مذکورہ خاکے کی پیروی کی جائے تو یہ مشکل بڑی حد تک آسان ہو جاتی ہے۔ زحافات کی وجہ سے جہاں آدھی آوازیں وزن میں آتی ہیں وہاں زیرِ بحث حرف اللفظ کے نیچے ہلند لگا دینے سے یہ مسئلہ بھی حل ہو سکتا ہے۔ جیسے اکُ کے لیے اور (ا) اور نون غنہ کے لیے ن جیسے یہاں کے لیے - رواں اور نثری ترجمے میں، رواں اور نثری اسلوب میں مطلب بیان کر دیا جائے۔

(س)، اصلاحی جستجو :- ادھر کچھ عرصے سے کم علمیت، ناتجربہ کاری اور تن آسانی کی علتوں

کی وجہ سے بہت سی غلط روشیں قائم ہوتی جارہی ہیں۔ مگر یہ کسی بھی صورت اور کسی بھی قیمت پر مناسب نہیں زبان اور علم زبان کا شعور رکھنے والوں کو اس سلسلے میں ضرور توجہ کرنی چاہیے جیسے تانا شاہی کا محاورہ انتہائی غلط معنوں میں رواج پا چکا ہے۔ موجودہ مروّجہ معنی یہ کہ من مانی کی جائے، ہٹ دھرمی سے کام لیا جائے۔ ظلم و زیادتی کی جائے۔ اس کے لیے نادر شاہی ہے تانا شاہی گولکنڈے کے نازک مزاج بادشاہ سے جڑی ہوئی ترکیب اور علامت ہے۔ اس سے حقیقی مراد نازک مزاجی ہے نہ کہ ظلم و زیادتی کی ہٹ دھرمی یا من مانی کرنے کا عمل اسی طرح لپیٹ میں آنے کو چپیٹ میں آنا کر دیا گیا۔ لفظ کارروائی ہے نہ کہ کاریہ واہی۔ قلم مذکر ہے خواہ اردو میں ہو کہ ہندی میں اس لیے میرا قلم ہی کہنا اور لکھنا چاہیے۔ نہ کہ میری قلم۔

بہر حال کوشش کی گئی ہے کہ اس مختصر سی گفتگو میں زیر بحث موضوع سے متعلق تقریباً تمام اہم پہلوؤں کا احاطہ کیا جائے اور مناسب تراکیب و تدابیر تجویز کی جائیں۔ میں نے کوشش کی ہے کہ اپنے علم اور تجربے کی روشنی میں ان مسائل کی نشاندہی کروں ساتھ ہی ان کے ممکنہ حل کی طرف بھی اشارے کروں۔ یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ یہ کوششیں کس حد تک کارگر ثابت ہوتی ہیں۔ میرا تو یہی ایقان ہے کہ مجوزہ تجاویز پر عمل کیا جائے تو اردو سے ہندی اور ہندی سے اردو میں ترجمے کے مسائل کے ساتھ ساتھ اردو عربی فارسی کے الفاظ کو ہندی کے دیوناگری رسم الخط میں بھی کامیابی سے منتقل کیا جا سکتا ہے۔

انتظامیہ کی کچھ اہم انگریزی، ہندی اور اردو اصطلاحات

ادبی شہ پاروں کا لفظی ترجمہ عیب سمجھا جاتا ہے۔ کیوں کہ عام طور سے لفظی ترجمے میں شاعر یا ادیب کا اصل مفہوم خبط ہو جاتا ہے، اس لیے ادبی تحریروں کے ترجمے میں مترجم کو خاص آزادی لینی ہوتی ہے۔ وہ عام طور سے شاعر یا ادیب کا اصل مفہوم سمجھ کر اسے اپنی زبان میں بیان کر دیتا ہے۔ لیکن سرکاری دستاویزوں اور خط و کتابت میں لفظی ترجمہ کرنا ہوتا ہے۔ کیوں کہ اگر مفہوم میں تھوڑا سا بھی فرق آگیا تو بہت مشکل کا سامنا کرنا پڑ جاتا ہے۔ اس طرح کا ترجمہ ممکن ہے کہ بُرا لگے۔ لیکن یہ اتنا بڑا عیب نہیں ہے جتنا بڑا عیب یہ ہے کہ مترجم اصل مفہوم سے تجاوز کرے۔ بعض اوقات سرکاری دستاویزوں اور خط و کتابت کے ایک ایک لفظ پر عدالت میں بحث ہوتی ہے، اس لیے ہمیں ان معاملات میں لفظی ترجموں کو اہمیت دینی چاہیے۔

اگر آپ ہندی سے اردو میں ترجمہ کر رہے ہیں اور کوئی لفظ ایسا آگیا ہے، جس کا اُردو مترادف آپ کے ذہن میں نہیں آرہا تو کوئی حرج نہیں —— آپ ہندی کا اصل لفظ استعمال کیجیے۔ اسی طرح ہندی ترجموں میں اُردو کا لفظ استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں! کبھی کبھی ممکن ہے کہ انگلش کا لفظ بھی استعمال کرنا پڑے۔ اہمیت اس کی نہیں ہے کہ آپ نے ایک ایک لفظ کا ترجمہ کیا ہے یا نہیں۔ اہمیت اس کی ہے کہ آپ نے اصل تحریر کا مکمل مفہوم ترجمے میں بیان کیا ہے یا نہیں۔

میں نے انگلش، ہندی، اردو الفاظ اور اصطلاحات کی فہرست مرتب کرتے ہوئے درج ذیل دو کتابوں سے خاص طور سے استفادہ کیا ہے۔

ا: دفتری ترکیبات، محاورات اور فقرات کی لغت، مجیب الرحمن مفتی، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء

2- बृहत प्रशासन शब्दावली, मानव संसाधन विकास मंत्रालय, नई दिल्ली। 1993

Abandon	छोड़ देना,	ترک کرنا
Abate	घटना, घटाना	کم ہونا، اُترنا
Abolish	समाप्त करना, अंत करना	ختم کرنا، منسوخ کرنا
Abet	मदद करना, उकसाना	معاونت کرنا (جرم میں)
Abeyance	प्रास्थगन, स्थगन	اِلتوا
Abide by the rules	नियम का पालन करना	قواعد کی پابندی کرنا
Ability	योग्यता	اہلیت، قابلیت، استطاعت
Above	के ऊपर, ऊपर	اوپر، بالا
Above cited	उपर्युक्त, ऊपर उद्धत	مذکورہ بالا
Abroad	विदेश में	بیرونِ ملک
Abrogate	रद्द करना, निराकरण करना	تنسیخ کرنا
Abrupt	अचानक, एकदम	اچانک، ناگہانی
Abscond	फ़रार होना	فرار ہونا، روپوش ہونا
Absence	ग़ैरहाज़िरी	غیر حاضری
Absentee	ग़ैरहाज़िर	غیر حاضر
Absentia, in	ग़ैरहाज़िरी में	عدمِ حاضری

Absolve	मुक्त करना, छुटकारा देना	بَری کرنا، بَری ہونا
Abstract	सारांश, सार	خلاصہ کرنا، خاکہ
Abstain	अलग रहना, दूर रहना	باز رہنا، حصّہ نہ لینا
Abundant	प्रचुर, बहुत	وافر، افراط
Abundant Proof	प्रचुर सबूत	وافر ثبوت
Abuse	दुरुपयोग	ناجائز استعمال، بدکلامی
Academic	शैक्षिक, शास्त्रीय	علمی
.....Ability	शैक्षिक योग्यता	علمی قابلیت
.....year	शैक्षिक साल	تعلیمی سال
Academy	अकादमी	اکادمی
Accede	स्वीकार करना, शामिल होना	منظور کرنا، شامل کرنا
Accept	स्वीकार करना, मानना	منظور کرنا
According to	के अनुसार	بموجب، بلحاظ، بقول
Account	खाता, हिसाब, लेखा	حساب، کھاتہ
.....book	खाता, लेखा, बही, लेखा पुस्तक	بہی کھاتہ، کتاب حسابات
Accountant	लेखाकार	محاسب
Take an account	हिसाब मांगना	حساب طلب کرنا
Take in account	ध्यान में रखना	ملحوظ رکھنا
Accountability	जवाबदेही, उत्तरदायित्व	جواب دِہی، ذمہ داری
Accountancy	लेखविधि, लेखाशास्त्रा	حساب داری، حساب دانی
Accredit	मानना, प्रत्यायित करना	اختیار کرنا، مجاز کرنا
Accrue	जमा होना प्रोद्भूत होना	جمع ہونا
Accumulate	बहुत अधिक बढ़ना, निरंतर बढ़ते रहना	جمع کرنا

www.kitaabistan.com

Accuracy	सही, ठीक, यथार्थता	درست، ٹھیک، صحیح
Acknowledge	प्राप्ति, स्वीकार करना	رسید دینا، تسلیم کرنا
Acquire	अर्जन करना	حاصل کرنا، اکتساب کرنا
Act	कार्य, अधिनियम	فعل، عمل، قانون
Acting (as acting director)	कार्यकारी	قائم مقام
.....Allowance	कार्यकारी भत्ता	بھتہ قائم مقامی
Action	कार्रवाई, क्रिया	کاروائی
Actual	वास्तविक	واقعی، اصلی
Add	जोड़ना	جمع کرنا، جوڑنا
Addition	योग, जोड़, परिवर्धन	جمع، اضافہ، میزان
Additional	अतिरिक्त	اضافی، زائد
Adhoc	तदर्थ	فی الواقعی، اڈہاک
Adjourn	स्थगित करना, काम रोकना	کام روکنا
Adjustment	समायोजन	ترتیب، ہم آہنگی، توافق
Administer	प्रशासन करना, देना, दिलाना	بندوبست کرنا، انتظام کرنا
Administrative	प्रशासनिक, प्रशासी	انتظامی
.....Ability	प्रशासन क्षमता	انتظامی صلاحیت
.....measures	प्रशासनिक उपाय	انتظامی اقدامات
.....sanction	प्रशासनिक मंजूरी	انتظامی منظوری
Admission	स्वीकृति, प्रवेश	داخلہ، شمولیت
Advance	अग्रिम, पेशगी	پیشگی، ترقی دینا
....increments	अग्रिम वृद्धि	پیشگی اضافے
....payment	अग्रिम अदायगी	پیشگی ادائیگی

Advance planning	अग्रिम आयोजन	پیشگی منصوبہ بندی
..... ticket	अग्रिम टिकट	پیشگی ٹکٹ
Advantage	लाभ, हित	فائدہ، مفاد
Advantageous	लाभप्रद, लाभकारी	مفید، سودمند
Advent	आगमन	آمد
Adventitious	आकस्मिक, आगंतुक	خارجی، بدیسی
..... aid	आकस्मिक सहाय	بیرونی امداد
..... dependants	आगंतुक आश्रित	بدیسی دست نگر
..... roots	आगंतुक मूल	بیرونی اساس
Adventure	साहस, ख़तरा, साहस-कर्म	مہم، کارِنمایاں
Adventurer	साहसिक, साहसी	مہم جو، جانباز
Adversary	विरोधी, प्रतिपक्षी	دشمن، مخالف
Adverse	प्रतिकूल, विरुद्ध	مخالف، ناموافق
..... balance	प्रतिकूल शेष	نقصان
Advice	परामर्श, सलाह, सूचना, संज्ञापन	مشورہ، اطلاع
Advise	सलाह देना	مشورہ دینا
Advisor	सलाहकार	مشیر
Advisory (committee)	सलाहकार समिति	مشاورتی کمیٹی
Affidavit	हलफ़नामा, शपथपत्र	حلف نامہ
Affiliate	संबद्ध करना	الحاق کرنا
Aforesaid	पूर्वोक्त	مذکورہ بالا
Age	आयु, युग	عمر، زمانہ

www.kitaabistan.com

Agenda	कार्यसूची	ایجنڈا
Aggregate	कुल, पूर्णयोग	مجموعہ، مجموعی
Agree	सहमत होना, राज़ी होना	اتفاق کرنا، متفق ہونا
Agreement	सहमति, करार, अनुबन्ध	اتفاق، ہم آہنگی، معاہدہ
Aid	सहायता, मदद	امداد
Allegation	अभिकथन	الزام
Allegiance	निष्ठा	مثالی، مجازی
Allocate	बाँटना, विनिधान करना	مختص کرنا
Allocation	बँटवारा, विभाजन नियतन	تخصیص
Allotment	आबंटन	تعین
Allow	इजाज़त देना, आज्ञा देना	اجازت دینا
Allowance	भत्ता	الاؤنس، بھتہ
Alternative	विकल्प, वैकल्पिक,	متبادل
Amend	संशोधित करना, संशोधन करना	ترمیم کرنا
Amendment	संशोधन	ترمیم
Amount	राशि, रकम, मात्रा	رقم، مقدار
Analysis	विश्लेषण	تجزیہ
Annexe	संलग्न, जोड़ना, नत्थी करना	منسلک کرنا
Annexure	संलग्न	منسلکہ
Annual	वार्षिक	سالانہ
Annuity	वार्षिकी	سالیانہ
Anomaly	असंगति, विषमता	عدم یکسانیت، بے ضابطگی
Anonymous	अनाम, गुमनाम	گمنام

Answerable	जवाबदेह, उत्तदायी	جواب دہ
Anticipation	प्रत्याशा, पूर्वानुमान	توقع
Apology	क्षमायाचना	معافی
Appeal	अपील, अपील करना	اپیل، اپیل کرنا
Applicant	आवेदक	درخواست دہندہ
Application	आवेदन, अर्ज़ी	عرضی، درخواست
Appoint	नियुक्त करना	تقرر کرنا
Appointee	नियुक्त, व्यक्ति	جس کا تقرر ہوا ہو
Appointment	नियुक्ति	تقرر
..ad hoc	तदर्थ नियुक्ति	اڈہاک تقرر
Apprehend	पकड़ना, गिरफ्तार करना	گرفتار کرنا
Appropriate	उपयुक्त, उचित, विनियोजन करना	مناسب، موزوں، قبضہ کرنا
Approval	अनुमोदन	منظوری
Approve	अनुमोदन करना	منظور کرنا
Arbitration	विवाचन, माध्यस्थम्	ثالثی فیصلہ، پنچائتی فیصلہ
Arbitrator	मध्यस्थ	ثالث
Arrangment	व्यवस्था	ترتیب
Arrears	बकाया	بقایا
Assembly	सभा, जमघट, जमाव	اسمبلی، مجلس
Assent	अनुमति देना, अनुमति	منظوری، منظوری دینا
Assess	(कर या मूल्य) निर्धारित करना	تشخیص، تعین
Assessment	(कर) निर्धारण	تشخیص، تعین
Assistant	सहायक	مددگار

www.Kitaabistan.com

Assumption	अंगीकार, ग्रहण, कल्पना	اختیار، قیاس، مفروضہ
Audit	लेखापरीक्षा	محاسبہ
.....accounts	परीक्षित लेखा	محاسبہ، اخراجات
....report	लेखापरीक्षा रिपोर्ट	محاسبی رپورٹ، آڈٹ رپورٹ
Auditor	लेखा परीक्षक	محاسب
Authentic	प्रमाणित	مصدّقہ
Authenticate	प्रमाणित करना	تصدیق کرنا
Authorise	अधिकार देना, प्राधिकृत करना	بااختیار کرنا
Authority	प्रधिकारी, अधिकार, सत्ता	حاکم مجاز، اختیار، سند
Available	प्राप्त, उपलब्ध	دستیاب، قابلِ حصول
Average	औसत	اوسط
Award	पुरस्कार, पंचाट देना	انعام، عطیہ، فیصلہ (ثالثی)
Backward	पिछड़े वर्ग	پس ماندہ (طبقے)
Bail	ज़मानत	ضمانت
Balance	शेष, बाक़ी, संतुलन, तुला, तराज़	باقی، توازن، ترازو
Ballot	मतपत्रा, मतदान	رائے دہی، بیلٹ
Ban	रोक, पाबंदी, प्रतिबंध	پابندی، امتناع
Bargain	सौदा, सौदा करना	سودا، مول تول کرنا
Basic	मूल, बुनियादी	بنیادی
Beneficial	लाभप्रद	نفع بخش
Beneficiary	हिताधिकारी	فائدہ اٹھانے والا
Benefit	हित, लाभ	فائدہ
Benevolence	हितकारिता	رفاہی

Bill	विधेयक, बिल, बीजक	بل، مسودہ قانون
Black list	काली सूची	سیاہ فہرست
Board	बोर्ड, मंडल	بورڈ، مجلس
Body	निकाय	جسم، جماعت
Bonafide	वास्तविक, सद्भावपूर्वक	حقیقی، جائز
Bond	बंधपत्रा, बॉण्ड	تمسک، ضمانت، مچلکہ
Bonus	बोनस	بونس
Borrow	उधार लेना	قرض لینا
Breach	भंग	خلاف ورزی
....agreement	क़रार-भंग	معاہدے کی خلاف ورزی
.....of law	विधि-भंग, क़ानून तोड़ना	قانون شکنی
.....of rules	नियम-भंग	قواعد شکنی
Break in service	सेवा में व्यवधान	ملازمت میں وقفہ
Bribe	घूस, रिश्वत	رشوت
Bribery	रिश्वतखोरी	رشوت خوری
Budget	बजट, आय-व्ययक	بجٹ، میزانیہ
...estimates	बजट प्राक्कलन, बजट अनुमान	تخمینۂ میزانیہ
By special messenger	ख़ास आदमी के ज़रिये	بذریعہ ہرکارۂ خاص
Cabinet	मंत्रिमंडल, अलमारी	کیبنٹ، کابینہ
Calculate	परिकलन	حساب لگانا
Cancellation	रद्द करना	تنسیخ
Capital	पूँजी, मूलधन, राजधानी, मृत्यु से दंडनीय	سرمایہ، راس المال

www.kitaabistan.com

....account	पूँजीगत लेखा	راس المالی حساب
Cash	रोकड़, भुनाना	نقد، بھنانا
.....balance	रोकड़ शेष, रोकड़ बाकी	باقی نقد
....book	रोकड़, बही	کیش بک، کھاتہ نقدی
Cashier	रोकड़िया, ख़ज़ांची	خازن، خزانچی
Casual	आकस्मिक	اتفاقی، وقتی
....leave	आकस्मिक छुट्टी	اتفاقی رخصت
Censure	निन्दा	تہدید، ملامت
Certificate	प्रमाणपत्र, सर्टिफ़िकेट	سند، سرٹیفکٹ
Certify	प्रमाणित करना	تصدیق کرنا
Challan	चालान,	چالان
Character	चरित्र	چال چلن، کردار
....certificate	चरित्र प्रमाणपत्र	تصدیق نامۂ چال چلن
Charge	आरोप, कार्यभार, प्रभार	الزام، تحویل، چارج
Charge sheet	आरोप पत्र	فردِ جرم
Cheating	छल, छल करना	دھوکا دہی
Check	रोक, पड़ताल जांच	روک، پڑتال، اِنسداد
Circular	गश्ती, चिट्ठी, परिपत्रा	گشتی مراسلہ
Civil	सिविल, नागरिक, असैनिक	شہری، سِول
Civil marriage	सिविल विवाह	سِول شادی
.....rights	नागरिक अधिकार	شہری حقوق
.....suit	सिविलवाद	دیوانی مقدمہ
Claim	दावा, दावा करना	مطالبہ، دعوے کرنا

Clarification	स्पष्टीकरण	وضاحت
Class	वर्ग, दर्जा, कक्षा	جماعت، درجہ
Clause	खंड	دفعہ
Clerical	लिपिकीय, लेखन संबंधी	محرّری، تحریر سے متعلق
Clerk	क्लर्क, बाबू	محرّر
Code	संहिता, कोड संकेत	مجموعۂ ضوابط، ضابطہ، خفیہ
....number	संकेत संख्या	خفیہ نمبر
Commencement	प्रारंभ	ابتدا، آغاز
Commensurate	अनुरूप	متناسب، مطابق
Commission	आयोग, आढ़त, कमीशन	آڑھت، کمیشن
Committee	समिति	کمیٹی
Communal	साम्प्रदायिक	فرقہ وارانہ
Commutation	परिवर्तन, सारांशीकरण, लघुकरन	تبادل، معاوضہ، تبدیلی
Compensation	प्रतिपूर्ति, प्रतिकर	معاوضہ، تلافی، ہرجانہ
Compensatory	प्रतिकर	متلافی
....allowance	प्रतिकर भत्ता	متلافی الاؤنس
...leave	प्रतिपूरक छट्टी	متلافی چھٹی
Competent	सक्षम	اہل، مجاز، بااختیار
....authority	सक्षम प्राधिकारी	حاکمِ مجاز
Competitive	प्रतियोगिता	مقابلے کا
....examination	प्रतियोगिता परीक्षा	مقابلے کا امتحان
Concessional	रियायती	رعایتی
Condition	शर्त, प्रतिबंध, दशा, स्थिति	شرط، حالت، اقرار

www.kitaabistan.com

Conditional	सशर्त	حالت ، شرط
Condone	माफ करना	معاف کرنا
Conduct	आचरण, संचालित करना	چلن ، رویہ ، انتظام کرنا
Confer	प्रदान करना, विचार-विमर्श करना	عطا کرنا
Conference	सम्मेलन	کانفرنس
Confidential	गोपनीय, अंतरंग	خفیہ ، بصیغۂ راز
Confirmation	पुष्टि	توثیق، مستقلی (ملازمت)
...orders	पुष्टि आदेश	احکامِ مستقلی
Consent	सम्मति मेल	رضامندی
Consult	प्रामर्श करना	مشورہ لینا/کرنا
Consultant	प्रामर्शदाता	مشورہ دینے والا
Contingencies	आकस्मिक व्यय	اِتّفاقی
Convene	संयोजन करना, बुलाना	جمع ہونے کیلئے بلانا، میٹنگ کی دعوت دینا
Convener	संयोजक	داعی ، کنوینر
Conveyance	सुविधा, परिवहन, सवारी	سواری
....allowance	सवारी भत्ता	سواری الاؤنس
Co-opt	सहयोजित करना	ساتھ لینا، نامزد کرلینا
Copy	प्रतिलिपि, नक़ल, प्रति	کاپی ، نقل
Correction	मूल सुधार, सुधार	تصحیح
Correspond	पत्रा व्यवहार, समरूप होना पत्राचार करना	مراسلت کرنا
Corresponding	तदनुरूप	مطابق
Corrigendum	शुद्धि पत्र	تصحیح نامہ
Corrupt	भ्रष्ट, भ्रष्ट करना	بدکردار ، خراب کرنا

Council	परिषद	کونسل
Cost	लागत	لاگت ، قیمت
Court	न्यायालय	عدالت
Credentials	प्रत्ययपत्रा	اسناد
Credit	उधार, जमा, साख	قرضہ، جمع ، ساکھ
Creditable	प्रशंसनीय, सराहनीय	قابلِ تعریف
Current	चालू, प्रचलित	جاری ، چالو ، رواں
account	चालू खाता	رواں حساب
.....session	चालू सत्रा, चालू अधिवेशन	جاریہ اجلاس
....year	चालू वर्ष	سالِ رواں
Deal	सौदा, व्यवहार करना	سودا، معاملہ ، بیوپار
Dearness	महँगाई	مہنگائی
.....allowance	महँगाई भत्ता	مہنگائی الاؤنس
Death	मृत्यु, मौत, निधन	موت ، وفات
.....anniversary	पुण्यतिथि	یوم وفات، برسی
....sentence	मौत की सज़ा	سزائے موت
Debar	रोकना, विवर्जित करना	روکنا، خارج کرنا، باز رکھنا
Debenture	डिबेंचर	تمسک ، سندِ قرضہ
Debt	ऋण	حساب میں ڈالنا
Decision	विनिश्चय (विधि), निर्णय, फैसला	فیصلہ
Deduct	कटौती करना, काटना	کٹوتی کرنا، منہا کرنا
Deduction	कटौती, घटाव	کٹوتی، منہائی
Deed	विलेख, कार्य, पट्टा	دستاویز

www.kitaabistan.com

Defamation	मानहानि	بدنامی، ہتک عزت
Default	चूक, व्यतिक्रम, बकाया	کوتاہی کرنا، غفلت کرنا
Defaulter	चूक करने वाला, व्यतिक्रमी, बकायादार	عہد شکن
Defect	कमी, कसर, ख़राबी	خامی، کمی، نقص
Defence	रक्षा, बचाव, प्रतिवाद (विधि)	دفاع ،صفائی (قانون)
Defer	टालना, आस्थागित करना	ملتوی کرنا، تاخیر کرنا
Deferred	आस्थगित	ملتوی
Deficiency	कमी	کمی ، نقص
Deficit	घाटा, कमी	خسارہ ، گھاٹا، کمی
Delegate	प्रतिनिधि, दे देना, सौंपना	مندوب
Delegation	प्रतिनिधि मंडल, प्रत्यायोजन	وفد
.....of powers	शक्तियों का प्रत्यायोजन	تفویض کرنا (اختیارات وغیرہ)
Delete	हटाना, निकालना	خذف کرنا
Deleberations	विचार विमर्श	غور و فکر
Deliver	देना, सौंपना,	دینا، سونپنا
Demand	मांग, अभियाचना	مطالبہ ، طلب
Demi official	अर्धशासकीय	نیم سرکاری
Demi official letter	अर्धशासकीय पत्रा	نیم سرکاری خط
Demonstration	प्रदर्शन, निदर्शन, प्रमाण	مظاہرہ ، نمائش
Demote	पदावनत करना, पद घटाना	عہدہ کم کرنا
Demotion	पदावनति	عہدے میں کمی
Denovo	नए सिरे से	ازسرِ نو

Departmental	विभागीय	سررشتے کا، محکمے کا
.....enquiry	विभागीय जांच	محکمانہ تحقیق
.....order	विभागीय आदेश	محکمانہ حکم
.....promotion	विभागीय पदोन्नति, विभागीय तरक्की	محکمانہ ترقی
Deposit	जमा, निक्षेप	جمع ، جمع کرنا
Depositor	जमा करने वाला	جمع کرنے والا
Depot	डिपो	گودام، سٹور ، ڈپو
Depreciation	मूल्यहास, अवक्षय	فرسودگی (عمارت یا مشین وغیرہ کی)
Deprive	वंचित करना	محروم کرنا
Deputation	प्रतिनियुक्ति, शिष्टमंडल	وفد ، نمائندوں کی جماعت
....allowance	प्रतिनियुक्ति भत्ता	نمائندگی الاؤنس
Deputy	उप	نائب
Deserving	सुपात्रा	مستحق
Despatch	रवानगी, प्रेषित करना, रवाना करना	ترسیل
.....office	प्रेषण कार्यालय	دفترِ ترسیل
.....register	प्रेषण रजिस्टर	رجسٹر ترسیل
Despatcher	प्रेषक, भेजने वाला	ترسیل کرنے والا
Detail	ब्योरा	تفصیل
Devaluation	अवमूल्यन	تخفیفِ قیمت
Development	विकास	ترقی
Dictation	श्रुतलेख	املا
Diplomatic	राजनयिक, कूट-नीतिक	سفارتی
....corps	राजनयिक कोर	سفارتی زمرہ

www.kitaabistan.com

Direct-action	प्रत्यक्ष निर्वाचन, सीधा निर्वाचन	براہِ راست کارروائی
Disbursement	संवितरण, बांटना	ادائیگی
Discipline	अनुशासन	نظم و ضبط
Disciplinary	अनुशासनिक	انضباطی
....action	अनुशासनिक कार्रवाई	تادیبی کارروائی
Discount	बट्टा	چھوٹ، رعایت
Dismiss	बरख़ास्त करना, ख़ारिज करना	برخاست کرنا، موقوف کرنا
Dismissal	पदच्युति	موقوفی (ملازمت سے)
Disparity	असमानता	عدمِ مساوات
Disposal	निपटाना, निवर्तन	فروخت، نکاسی، تصفیہ
Document	दस्तावेज़, प्रलेख	دستاویز
Duly	विधितु, यथाविधि	ٹھیک طریقے سے
Dummy	डमी, नक़ली	نقلی، مصنوعی
Duty	ड्यूटी, कर्तव्य-भार, कार्य, काम, शुल्क	ڈیوٹی، فرض، کام
Earmarked	उददिष्ट करना	متعین کرنا (سرمایہ)
Economic	आर्थिक, अर्थशास्त्रीय, अर्थकर, किफ़ायती	کفایتی، اقتصادی
Economy	अर्थशास्त्रा	معیشت، کفالت
Eligible	पात्रा	مستحق
Embezzlement	ग़बन	غبن
Emergency	आपात, आपातकाल	ہنگامی
Emoluments	परिलब्धियाँ	آمدنی
Employ	नियुक्त करना, नियोजित करना	ملازم رکھنا، کام میں لانا
Employee	कर्मचारी	ملازم

Employer	नियोक्ता	آجر، مالک
Employment	नौकरी, सेवायोजन, नियोजन	ملازمت، نوکری
Enclose	अनुलग्न करना, संलग्न करना	ملفوف
Enclosure	अनुलग्नक	ملفوفہ
Endorse	पृष्ठांकन, सही करना	تصدیق کرنا، ٹھیک کرنا
Enforcement	प्रवर्तन	نفاذ، تعمیل
Enhancement	वृद्धि, बढ़ोतरी	اِضافہ
Enquiry	पूछताछ, जांच	تحقیق، جانچ
Equipment	उपस्कर, सज्जा	سازوسامان
Equivalent	पर्याय, समकक्ष	مساوی، برابر
Error	त्रुटि, भूल, ग़लती	غلطی
...& omission	भूल-चूक	بھول چوک
Essential	अनिवार्य	لازمی، ضروری
Estimate	आकलन, प्राक्कलन, अनुमान, आकलन करना	تخمینی لاگت
Evade	टालना, अपवंचन करना (विधि)	گریز کرنا، پہلوتہی کرنا
Evaluation	मुल्यांकन	قدر و قیمت کا اندازہ
Exemption	छूट, माफ़ी	معافی، چھوٹ
Expenditure	व्यय, ख़र्च	اخراجات
Explanation	व्याख्या, स्पष्टीकरण	جواب، تشریح
Export	निर्यात	برآمد
Extension	विस्तार	توسیع
File	मिसिल, फ़ाइल	فائل، مسل
Final	अंतिम	آخری، قطعی

www.kitaabistan.com

Financial	वित्तीय, वित्त संबंधी	مالی، مالیاتی
Forfeiture	ज़ब्ती, समपहरण	ضبطی
Formal	औपचारिक	رسمی، باضابطہ
Forthcoming	आगामी	آئندہ پیش آنے والا
Fore-with	फ़ौरन	فی الفور
Fraud	कपट, छल	دھوکا، فریب
Fund	निधि	سرمایہ، رقم
Gazette	गज़ट, राजपत्र	گزٹ
Gazetted	राजपत्रिक	درج گزٹ
Grade	ग्रेड, श्रेणी	گریڈ
Graft	रिश्वत, अनुचित लाभ	ناجائز، آمدنی، رشوت
Grant	अनुदान, प्रदान करना स्वीकार करना	منظوری، منظور شدہ رقم، عطیہ
Gratuity	उपदान	انعامیہ
Grievance	शिकायत	شکایت
Guarantee	ज़मानत, गरंटी	ضمانت، گارنٹی
Guard	रक्षक	محافظ، پہرہ
Guilty	दोषी	قصوروار، مجرم
Heir	वारिस	وارث
Here after	इसके बाद	اس کے بعد
Hereby	इसके द्वारा	بذریعہ ہذا
Herewith	इसके साथ	اس کے ساتھ
His Excellency	परम श्रेष्ठ	عزت مآب

Honorarium	मानदेय	اعزازیہ
Honorary	अवैतनिक	اعزازی
Identification	पहचान, शनाख़्त	شناخت
Illegal	अवैध	غیر قانونی
Immovable	अचल, स्थावर	غیر منقولہ
Import	आयात	درآمد
Impose	अधिरोपित करना	عائد کرنا
Imprest	अग्रदान	مستقل، پیشگی
In abeyance	प्रास्थनित	تعویق میں
Incentives	प्रोत्साहन	ترغیبات، محرکات
Increment	वेतन-वृद्धि	تنخواہ میں اضافہ، ترقی
Incumbent	पदधारी, पदस्थ	اسامی پر مامور شخص
Indemnity	क्षतिपूर्ति	تلافی، تاوان
Indent	माँग-पत्र	تحریری مطالبہ
Index	अनुक्रमणिका	اشاریہ
Indiscipline	अनुशासनहीनती	بدنظمی، بدانتظامی
Information	सूचना	اطلاع
Inquiry	जाँच, पूछताछ	تحقیقات
Inspect	निरीक्षण करना	معائنہ کرنا
Instalment	क़िस्त	قسط
Instigate	उकसाना	اُکسانا، ترغیب
Instructions	अनुदेश, हिदायत	ہدایات
Intelligence	आसूचना, प्रज्ञा	خبر، ذہانت

www.kitaabistan.com

Interim	अंतरिम	درمیانی، درمیانی مدت کا
Invalid	अविधिनान्य, अशक्त	معذور، جائز
Invest	निवेश करना	روپیہ لگانا
Invoiced	बीजक	بیجک
Irrecoverable	अप्रत्युदधरणीय	ناقابلِ وصول
Irregular	अनियमित	بے ضابطگی
Irrevocable	अटल	ناقابلِ تنسیخ
Job	नौकरी, काम	کام، ملازمت
Join	कार्यभार ग्रहण करना संयोजित करना	حاضری دینا
Judicial	निर्णय	عدالتی
Jurisdiction	अधिकार क्षेत्र	دائرۂ اختیار، اختیارِ سماعت (قانون)
Lapse	बीत जानआ, व्यपगत होना	سوختگی
Latest	नवीनतम	تازہ ترین
Lease	पट्टा, पट्टे पर देना	پٹہ، پٹے پر دینا
Legitimate	उचित, विधिसम्मत	جائز، قانونی
Liability	जवाब दही, ज़िम्मेदारी, क़र्ज़ दायित्व	ذمہ داری، جواب دہی، قرضہ
Liaison	संपर्क	رابطہ
Liquidation	परिसमापन, शोधन, निर्धारण	تصفیہ، کاروبار کا خاتمہ
Log Book	लॉग बुक, रोज़ नामचा	روزنامچہ
Maternity	प्रसूति, मातृत्व	زچگی
Mature	प्रौढ़, देय, पुर्णविकसित	بالغ، واجب الادا

Medical	चिकित्सा	طبی
Memorandum/ Memo	ज्ञापन	میمورنڈم، یادداشت
Merit	गुण	قابلیت، مستحق ہونا
Misappropriate	दुर्विनियोग	ناجائز تصرّف، خیانت
Misbehaviour	दुर्व्यवहार	بدسلوکی
Misconduct	कदाचार, दुराचरण	غلط روی
Mismanagement	कुप्रबंध	بدانتظامی
Motion	प्रस्ताव	تجویز
Negligence	उपेक्षा, ग़फ़लत	غفلت
Oath	शपथ	حلف وفاداری
Obligatory	अनिवार्य	لازمی
Office	दफ़्तर, कार्यालय	دفتر
Officiate	स्थानापन्न होना	قائم مقامی کرنا
Pass	पारण, पास करना, गुज़रना	منظور کرنا، کامیاب ہونا، مرجانا
Pay	वेतन	تنخواہ
Payee	पाने वाला	پانے والا
Payment	भुगतान, अदायगी	ادائیگی
Penalty	दंड, जुर्माना	سزا، جرمانہ
Post	पद, डाक, चौकी	اسامی، مابعد، ڈاک، چوکی
Postpone	मुल्तवी करना	ملتوی کرنا
Promotion	तरक़्क़ी, वर्धन, प्रोन्नति	ترقی، فروغ
Property	संपति, गुण	املاک، جائداد، خاصیت

www.kitaabistan.com

Provident Fund	भविष्यनिधि	پراویڈنٹ فنڈ
Provision	उपबंध, शर्त	گنجائش، شرط
Reasonable	उचित, युक्तियुक्त	معقول، مناسب
Receipt	आय, रसीद	رسید، وصولی
Recognized	मान्य, मान्यताप्राप्त	منظور شدہ
Recommend	सिफ़ारिश करना	سفارش کرنا
Recruitment	भर्ति	بھرتی
Rectification	परिशोधन	تصحیح
Refund	(धन) वापसी	واپسی رقوم
Registration	पंजीकरण	رجسٹری کرنا/کرانا
Rehabilitation	पुनर्वास	بحالی، بحالیات (محکمہ)
Reimburse	प्रतिपूर्ति	بھرنا، واپس دینا
Reinforce	मदद देना, मज़बूत करना	مدد دینا، مضبوط کرنا
Reject	अस्वीकार करना	نامنظور کرنا
Reminder	स्मरण-पत्र	یاددہانی
Remittance	प्रेषित धन, भेजना	ترسیلِ رقم، بھیجنا
Removal	हटाया जाना, निष्कासन	برطرفی، اخراج، ہٹایا جانا
Remuneration	मेहनताना, पारिश्रमिक	معاوضہ، اجرت
Renew	नवीकरण करना, नूतन करना	تجدید کرنا
Repeal	निरसन, निरसन करना	تنسیخ کرنا
Reply	जवाब	جواب
Representative	प्रतिनिधि	نمائندہ
Reprimand	फटकार	سرزنش کرنا، سرزنش

Retirement	सेवा-निवृत्ति	سبکدوشی
Retrenchment	छंटनी	تخفیف
Return	विवरण, वापसी, प्रतिलाभ	گوشوارہ، واپسی، واپس کرنا
Revised	पुनरीक्षित करना	نظرثانی شدہ
Roster	रोस्टर	جدول، نقشہ
Routine	नेमी, दस्तूरी	معمول
Rules	नियम	قواعد
Sanction	मंज़ूरी, संस्वीकृति	منظوری، جواز
Satisfactory	संतोषप्रद, संतोषजनक	اطمینان بخش
Scheme	योजना	تجویز، منصوبہ
Scrutiny	छानबीन करना	تفتیش، چھان بین کرنا
Secrecy	गोपनीयता	رازداری
Secret	गुप्त	خفیہ
Security	प्रतिभूति	ضمانت، تمسک
Select	चयन करना	منتخب کرنا
Selection	चयन, प्रवरण	انتخاب
Senior	वरिष्ठ	اعلا، بڑا، متقدم ملازمت
Shorthand	आशुलिपि	مختصر نویسی
Sign	चिन्ह, हस्ताक्षर करना	نشان، دستخط کرنا
Signatory	हस्ताक्षर करने वाला	دستخط کرنے والا
Sine die	अनिश्चित काल के लिये	اگلی تاریخ کے تعین کے بغیر
Sir	श्रीमान, महोदय	جناب والا، جناب عالی
Specimen	निदर्श, नमूना	نمونہ

www.kitaabistan.com

Statistical	सांख्यकीय	اعداد و شمار سے متعلق
Status quo	यथापूर्व स्थिति	موجودہ حیثیت
Statutory	क़ानूनी, संविधि	قانونی
Subsidiary	गौण, सहायक	امدادی، ضمنی
Substitute	एवज़ी, प्रतिस्थानिक	عوضی
Sue	मुक़दमा करना	مقدمہ کرنا
Suspend	निलंबित करना, मुअत्तल करना	معطل کرنا، ملتوی کرنا
Tenure	अवधि, कार्यकाल	زمانہ، میعاد
Term	शर्त, अवधि मियाद, शब्द	شرط، اصطلاح، مدت
Terminate	समाप्त करना	ختم کرنا، ہونا
Testimonial	शंसापत्र	سند
Total	कुल	میزان، کل
Training	प्रशिक्षण	تربیت، تربیت دینا
Undersigned	अधोहस्ताक्षरी	راقم، زیر دستخطی
Utilization	उपयोग	استعمال
Vacancy	रिक्ति, रिक्तता	خالی اسامی
Voucher	वाउचर	واؤچر
Warrant	वारंट, अधिपत्र	وارنٹ، اختیار نامہ، پروانہ
Where as	जबकि	جب کہ
Withdrawal	वापसी	واپسی
Witness	गवाह, साक्षी	گواہی

www.kitaabistan.com